مقالات

امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی

(از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

[مولانا مناظر احسن صاحب کا یہ نہایت بیش قیمت اور قابل قدر مضمون رسالہ "الفرقان" بریلی سے نقل کیا جاتا ہے۔ اس مضمون میں سر عنوان تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے سیاسی پہلو کو بنایا گیا ہے مگر اس ضمن میں فاضل مقالہ نگار نے ایسا مواد جمع کر دیا ہے جو اسلام کے نظریۂ حکومت پر اور اُس ارتجاعی تحریک پر جو روح اسلامی کے خلاف پہلی صدی ہجری کے وسط میں رونما ہوئی تھی، اچھی خاصی تیز روشنی ڈالتا ہے۔

دراصل یہ تاریخ کا ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ اسلام جو ایک عالمگیر اصلاحی و انقلابی تحریک کی حیثیت سے اُٹھا تھا اور جس نے سیاست و اجتماع کا بالکل ایک نیا نظریہ دنیا کے سامنے فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے پیش کیا تھا، اس کے پیرووں کا رخ یکایک خلافت راشدہ کے ڈھنگ پر چلتے چلتے آخر کس طرح ملوکیت اور قیصریت کی طرف پھر گیا۔ اس مسئلہ کے صحیح حل پر تاریخ اسلام کے صحیح فہم کا بہت کچھ انحصار ہے۔ مگر اس میں دو پیچیدگیاں ایسی واقع ہو گئی ہیں جنکی وجہ سے مسلمان عموماً اس گتھی کو سلجھانے میں ناکام ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ جس دور میں یہ جوابی انقلاب اور تغیر راہ واقع ہوا اس سے مسلمانوں کی گہری عقیدتیں وابستہ ہیں، اسلیے واقعات اور اشخاص کے متعلق جچی تلی رائے قائم کرتے ہوئے مسلمان ڈرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ۹۹ فی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگوں کو اسلام اور

مسلمان میں سخت التباس پیش آیا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ مسلمان کریں وہی اسلام ہے۔
وہ اس فرق کو نہیں سمجھتے کہ اسلام ایک تحریک کا نام ہے جو ایک خاص نظامِ فکر (Ideology)
پر مبنی تھی اور مسلمان ان قوموں اور انسانی گروہوں کا نام ہے جو اس تحریک کے زیر اثر آئے۔ اس فرق
کو پوری طرح محفوظ نہ رکھنے کی وجہ سے تاریخ مسلمین بعینہٖ تاریخ اسلام قرار دے لی گئی ہے اور اس طرح
تاریخ اسلام کا تصور بنیادی طور پر غلط ہو کر رہ گیا ہے۔ لوگ اس جوابی انقلاب سے پہلے اور اس کے
بعد کی تاریخ کو یکساں طور پر اسلامی تاریخ ہی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اسی نظر سے اس کو دیکھتے
بھی ہیں، حالانکہ اسلامی تاریخ کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جوابی
انقلاب سے پہلے تاریخ جس رفتار پر چل رہی تھی اس کے بعد یکایک اس کا راستہ بدل گیا اور وہ ایک
دوسرے راستہ پر پڑ گئی۔ اس مقالہ میں اگرچہ مولانا مناظر احسن صاحب نے پوری طرح اس پہلو کو
سامنے رکھ کر حالات مرتب نہیں کیے ہیں، تاہم جو مواد انہوں نے جمع کیا ہے اس میں ایک صاحب
بصیرت آدمی تاریخ کے اس تغیر کو صاف دیکھ سکتا ہے۔

اس مقالہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے ناظرین کو یہ بات اچھی طرح ذہن میں رکھنی چاہیے کہ تفصیلات
سے قطع نظر، اصولی حیثیت سے پوری انسانی تاریخ دراصل دو متقابل طاقتوں کی کشمکش کی تاریخ ہے۔
ایک اسلام یعنی دین فطرت (Real nature of man) کی قوت۔ دوسری جاہلیت یعنی
مسخ شدہ فطرتِ انسانی (Perverted nature of man) کی قوت۔ اس کشمکش میں کبھی اسلام
ابھر آتا ہے اور جاہلیت دب جاتی ہے، اور کبھی جاہلیت ابھر آتی ہے اور اسلام دب جاتا ہے جب
اسلام کا غلبہ ہوتا ہے تو جاہلیت اسکے خلاف رجعت (Reaction) کے لیے زور لگاتی
ہے اور جب جاہلیت ابھرتی ہے تو اسلام اسکے مقابلہ میں انقلاب کے لیے زور لگاتا ہے۔ دونوں قوتوں
کے لیے انسان ہی واسطہ (Agents) کی حیثیت سے کام کرتے ہیں، مگر اسلام اور جاہلیت کے

نازک اور باریک فروق کو بالکل واضح (Clear-cut) صورت میں بہت کم لوگ محسوس کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ ان دونوں کو غلط ملط کر کے کچھ اس طرح پراگندہ خیالی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کام تو جاہلیت کے لیے کر رہے ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلام کے لیے کر رہے ہیں، یا کام اسلامی ٹسنگ اور اسلامی تخیل پر شروع کرتے ہیں اور چلتے چلتے اسلامی سرحدوں سے گزر کر جاہلیت کی حدود میں چلے جاتے ہیں۔

اس طویل تاریخی کشمکش کے دوران میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ اسلام اپنی خالص صورت میں ظاہر ہوا اور تمدن و عمران کی بنیاد بنا۔ مثلاً حضرت موسیٰ کی قیادت میں اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی حکومت میں۔ مگر بعد میں پھر جاہلیت کی قوتیں زور پکڑتی رہیں اور اسلام سے جاہلی نظام زندگی کی طرف رجعت واقع ہو جاتی رہی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جو حالت رونما ہوئی تھی وہ دراصل اسلام کا ایک کامل و اکمل ظہور تھا جس میں جاہلیت کو پوری طرح جڑ سے اکھاڑ کر اجتماعی اخلاق و معاملات کی بنیاد خالص اسلامی اصولوں پر رکھی گئی تھی۔ جس سوسائٹی کو اس زبردست انقلابی طاقت نے جنم دیا تھا اس میں تمام افراد یا کم از کم انکی ایک عظیم اکثریت کی ذہنیت پوری طرح بدل گئی تھی، حتیٰ کہ زندگی کے تمام چھوٹے اور بڑے مسائل پر انکا زاویۂ نظر خالص اسلامی ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے سیاست و عمران کا وہ نظام قائم ہوا اور چل سکا جس کا رنگ عہد نبوی اور عہد صاحبین میں نظر آتا ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کی جماعت (Body-politic) میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہو گئی اور باہر سے بھی گھس آئی جو اپنے خیالات اور نقطۂ نظر میں جاہلیت کا ایک معتدبہ عنصر لیے ہوئے تھے۔ ان میں سے جو لوگ نومسلم تھے وہ اگرچہ تبدیل مسلک تو کر چکے تھے مگر خود پوری طرح تبدیل (Convert) نہیں ہوئے تھے اور زندگی کے بیشتر مسائل میں ان کے خیالات پر قدیم جاہلی تصورات کا غلبہ تھا۔ اور جو لوگ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہوئے تھے انکی تعلیم اور اخلاقی تربیت

ممکن نہ ہو سکی تھی کہ اسلام اور جاہلیت کے فرق کو واضح طور پر سمجھ سکتے۔ ان وجوہ سے ایک نئی حرکت شروع ہو گئی جو اسلام کے مقابلہ میں جوابی انقلاب کی طاقت Counter-revolutionary force تھی۔

اس جوابی انقلاب کا پہلا ظہور حضرت عثمانؓ کے عہد میں ہوا۔ جاہلی تصورات رکھنے والے بعض لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہ آسکتی تھی کہ جس سلطنت کو ایک شخص نے اپنی قوت بازو سے قائم کیا ہو وہ اسکے بعد اسکے خاندان کے بجائے دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائے۔ وہ خاندانی فرمانروائی (Dynastic rule) کو تو سمجھ سکتے تھے کیونکہ قدیم سے یہی دیکھتے چلے آتے تھے۔ مگر اسلامی خلافت کا انقلابی تصور ان کے دماغ کی گرفت سے باہر تھا۔ وہ اللہ کے رسول کو جو بادشاہوں کی خداوندی مٹانے اور خاندانوں کی ربوبیت کا خاتمہ کرنے آیا تھا، محض ایک بانیٔ سلطنت (Empire-builder) سمجھے اور انہوں نے چاہا کہ یہ سلطنت بھی اسی ڈھنگ پر چلے جس پر شاہان روم و عجم کی سلطنتیں چلتی آئی ہیں۔ یہ جاہلیت کی پہلی رجعت تھی اور قدیم رومی و عجمی آب و گل سے جنکی طینتیں بنی تھیں ان کو اس نے خوب اپیل کیا مگر یہ رجعت اتنی طاقتور نہ ہو سکی کہ اسلامی نظام تمدن کی اساس میں عملاً کوئی تغیر پیدا کر دیتی۔ اس نے صرف وہ کام کیا جو کسی عمارت کی بنیادوں میں سیل اور شور کا مجموعہ کرتا ہے، یعنی یہ کہ اندر ہی اندر ان کو کھوکھلا کرتا رہے۔

دوسری اور زیادہ طاقتور رجعت وہ تھی جو حضرت علی کے عہد میں شروع ہوئی۔ جاہلی تصورات .... رکھنے والے ایک دوسرے گروہ کی سمجھ میں وہ خشک، بے مزہ اور بے رونق خلافت کسی طرح نہ آتی تھی جس میں نہ شاہانہ کروفر ہو، نہ خدائی کا تخت ہو، نہ بندوں کے سر جھکیں، نہ خزانے کے منہ کھلیں، نہ اَنَا اَحْیٖ وَ اُمِیْتُ کے بے حد و حساب اختیارات ہوں۔ وہ بے لگام پادشاہی دیکھنے کے عادی تھے، وہی دیکھنا چاہتے تھے، اور وہی ان کی

سمجھ میں آسکتی تھی۔ وہ خلافت جو ابوبکرؓ و عمرؓ کر گئے اور جسکو حضرت علیؓ جاری رکھنا چاہتے تھے ان کو کسی طرح اپیل نہ کرتی تھی۔ حضرت علیؓ نے اس رجعت کو روکنے پر اپنا پورا زور صرف کیا، مگر رجعت کی پشت پر طاقت بہت زیادہ تھی اور اس وقت کی مسلم سوسائٹی میں صحیح اسلامی ذہنیت اور مضبوط کیرکٹر رکھنے والوں کی تعداد بلحاظ تناسب بہت کم تھی اسلیے حضرت علیؓ ناکام ہوئے، اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کا آخری فیصلہ کربلا میں ہوا جس کے بعد حکومت کی طاقت کلیتہً جاہلیت کے ہاتھ میں آگئی۔

اس رجعت کے نتیجہ میں جو نظام حکومت قائم ہوا وہ اپنی روح اور اپنی صورت دونوں کے لحاظ سے خالص بادشاہی نظام تھا، مگر دانستہ یا نادانستہ اس کو "خلافت" کے نام سے موسوم کیا گیا اور کیا جاتا رہا، حالانکہ اس کو خلافت کہنا ایسا ہی ہے جیسے عرق انگور سے جو شراب بن گئی ہو اسے پھر عرق انگور ہی کہا جائے۔ اس نام نہاد خلافت میں شاہانہ خدائی کا جو رنگ تھا اس پر ظل اللہی کا خوشنما لفظی پردہ ڈالا گیا۔ مسلمانوں کو ان بادشاہوں کی ظاہری اقامت حدود اور اجرائے قوانین شرعیہ سے دھوکہ میں ڈالنے کی کوشش کی گئی، اور جو مسلمان اسلام اور جاہلیت کے نظریات کا فرق نہ سمجھتے تھے انہوں نے اس سے خوب دھوکا کھایا۔ وہ ان جاہلی حکومتوں کو اسلامی حکومتیں سمجھتے رہے۔ انکے جھنڈے تلے جنگ کرنے کو جہاد فی سبیل اللہ خیال کرتے رہے۔ اور ان کی اطاعت کو اس اطاعت امیر کا ہم معنی سمجھتے رہے جس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔ مگر ابتدائی دو تین صدیوں میں علماء اور ائمۂ اسلام کی ایک معتدبہ جماعت ایسی موجود تھی جو پوری طرح سمجھتی تھی کہ یہ بادشاہی اسلامی نظریہ کی عین ضد ہے۔ یہ لوگ اس پر ہرگز راضی نہ تھے۔ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ جاہلیت کے ہاتھ میں حکومت کا اقتدار آجانے کی وجہ سے اخلاق، معاشرت، معیشت اور اجتماعی

زندگی کے تمام پہلوؤں میں جاہلی عناصر کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے اور بتدریج تمدن کا پورا نظام جو اسلامی اصولوں پر تعمیر کیا گیا تھا، اسلام کی بنیادوں سے اکھڑ کر جاہلیت کی بنیادوں پر جمتا چلا جا رہا ہے۔ اس مکمل تدریجی انقلاب کو ٹھنڈے پیٹوں دیکھتے رہنا ان لوگوں کے بس میں نہ تھا جو اسلام کو جان کر اور خوب سمجھ کر ایمان لائے تھے۔ ان کی طرف سے پیہم دو تین صدیوں تک خفیہ اور علانیہ کوششیں ہوتی رہیں کہ انقلاب کا رخ پھر جاہلیت سے اسلام کی طرف پھیر دیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ کوششیں کوئی نتیجہ خیز طریق کار اختیار نہ کر سکیں۔ اول اول مقامی طور پر مسلح شورشوں (Armed revolts) کا کچھ سلسلہ جاری رہا جن کے لیے جبابرۂ وقت کے مقابلہ میں کامیابی کا امکان بہت کم تھا۔ پھر انفرادی طور پر کہیں کہیں کسی جبار کے مقابلہ میں بس کلمۂ حق کا اعلان ہوتا رہا جس کے نتیجہ میں بعض اللہ کے نیک بندوں نے جانیں تو دیدیں مگر نظام حکومت میں کوئی فرق نہ آیا۔ پھر صلحاء کے ایک گروہ نے اجتماعی اصلاح و انقلاب سے مایوس ہو کر صرف انفرادی اخلاق اور سیرت کے تزکیہ اور اعتقادات کی اصلاح پر اپنی تمام مساعی مرکوز کر دیں۔ کوئی ایسا لیڈر ان بہت سی صدیوں میں پیدا نہ ہوا جو انبیاء علیہم السلام کے طرز پر ایک عمومی تحریک (Mass movement) خالص اسلامی بنیادوں پر لے کر اٹھتا — نبوت کا دعویٰ کر کے نئی امت نہ بناتا بلکہ نبی کی امت میں نبی کی وراثت کا حق ادا کرتا — اور آبادی کے ایک کثیر حصہ کو ہمہ گیر دعوت انقلاب سے حرکت میں لا کر تاریخ کی رفتار پھر سے بدل دیتا۔

اخیر کے دور میں محمد ابن عبدالوہاب، حضرت سید احمد شہید اور مہدی سوڈانی نے اس طرز پر کام کرنے کی کوشش کی۔ مگر ابن عبدالوہاب کی تحریک میں اسلام کا مفہوم تنگ تھا اور حدود سے بڑھ کر اسلام کی اشکال ماثورہ پر غیر معتدل زور دیا گیا تھا اسلیے وہ ناکام ہوئی۔ حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل رحمہما اللہ کی تحریک غلط فہمی کی شکار رہی۔ جن کمالوں

سے ان کا سابقہ تھا ان کو حقیقی مسلمان سمجھ کر انہوں نے گمان کیا کہ بس انہیں منظم کر کے نصب امارت کر دینے سے مسئلہ حل ہو جائیگا - یہ چونکہ پیش نظر مہم کا بہت کم تخمینہ (Under estimation) تھا اس وجہ سے انکی تحریک کو دردناک انجام سے دو چار ہونا پڑا - رہے مہدی سوڈانی سو انکی تحریک کو عہد بازی اور نصب العین کی کوتاہی نے ختم کیا - جمال الدین افغانی کے اثر کی وجہ سے اسلامی انقلاب کے ایجابی نصب العین کی بہ نسبت انگریزی امپیریلزم سے اپنے ملک کو بچانے کا سلبی نصب العین ان کے دماغ پر زیادہ مستولی تھا - انہوں نے بے صبری کے ساتھ اپنی انقلابی تحریک کو نیم پختہ حالت میں ایک زبردست مادی طاقت سے قبل از وقت لے جا کر ٹکرا دیا لہذا وہی انجام ہوا جو آب زمزم کے قرابے کو پتھر پر دے مارنے کا انجام طبعاً ہونا چاہیے -

میں اس نوٹ کو مستقل مضمون نہیں بنانا چاہتا لہذا اس بحث کو کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں - یہاں بس اتنا سمجھ لیجیے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ابتدائی دور کے ان جلیل القدر مفکرین میں سے ایک تھے جنہوں نے اسلامی تحریک کے خلاف اس جوابی انقلاب کا زور توڑنے میں فکری تعاون اور عملی جدوجہد دونوں طریقوں سے اپنی پوری طاقت صرف کی یہاں تک کہ اپنی جان بھی اسی کوشش میں قربان کر دی مگر وہ ایک فقیہ تھے اور انقلابی لیڈر کا پارٹ ادا کرنے کے لیے بنائے ہی نہیں گئے تھے، لہذا اجتماعی انقلاب برپا کرنے کے لیے جس قسم کی کوشش اس وقت مطلوب تھی وہ نہ کر سکے - [ایڈیٹر]

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی،

کس قدر عجیب ہے کہ کرۂ زمین کی چالیس کروڑ آبادی کا ایک ثلث سے زیادہ حصہ اپنی مذہبی زندگی میں اسلام کے جس تشریحی مکتب خیال کا پابند ہے، یعنی حنفی مذہب، اس مکتب کے مؤسس اول اور بانی اقدم حضرت امام الائمہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر، مختلف زبانوں میں اب تک سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں لیکن جہاں تک میری محدود نظر کا تعلق ہے، حیرت ہوتی ہے کہ امام صاحب کی زندگی کے ایک اہم

پہلو یعنی انکی سیاسی زندگی کے متعلق کسی نے اب تک مستقل طور پر کچھ نہیں لکھا - حالانکہ یہ سب جانتے ہیں اور تقریباً سب ہی لکھتے ہیں کہ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی میں جن دو حکومتوں یعنی بنی امیہ اور بنی عباس کو پایا انہیں ہر ایک سے آپکی مخالفت ہوئی اور شدید مخالفت ہوئی - بنی اُمیہ کے آخری گورنر عراق ابن ہبیرہ نے آپکو جیل اور تازیانے کی سخت سے سخت سزائیں دیں، یہاں تک کہ آپکے مشہور شاگرد رشید قاضی ابو یوسف کا بیان ہے کہ ابن ہبیرہ نے آپکے اتنے کوڑے لگوائے تھے کہ حتیٰ قطع لحمہ (آپکے جسم مبارک کا گوشت کٹ کٹ کر گر گیا) اور اس پر تو تقریباً تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ تازیانوں کی مار کے بعد صبح کو جب جیل سے باہر نکالے گئے تو،

حتیٰ انتفخ وجہہ ورأسہ من الضرب — آپکا چہرۂ مبارک اور سر مار کی شدت سے سوج گیا تھا۔

اور عباسی حکومت سے تو آخر میں آپکا اختلاف اس حد کو پہونچا کہ سب جانتے ہیں کہ اسی حکومت کے خلیفہ دوم ابو جعفر منصور کے حکم سے آپکو تازیانے کی سزا دی گئی، ایک دن نہیں، بلکہ مسلسل دس بارہ دن تک سیکڑوں کوڑے لگائے گئے، پھر آپکو دو ستونوں کے درمیان لٹکایا گیا، پھر آپکو سر بازار گشت کرایا گیا، مدتوں جیل میں رکھا گیا، بیچ بیچ میں پھر نکالا جاتا تھا اور تازیانے لگائے جاتے تھے، آخر میں منصور نے تھک کر آپکو زہر پلوایا اور اسی زہر سے بالآخر آپکی وفات ہوئی - یقیناً بہت زیادہ فکر و غور، تلاش و تجسس کی ضرورت تھی کہ آخر جس شخص کی عظمت آج ہی نہیں بلکہ اپنے عہد میں بھی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ خود اسی ابو جعفر منصور کے چچا عبدالصمد بن علی نے بھرے دربار میں ابو جعفر منصور کے سامنے یہ شہادت ادا کی تھی،

ماذا صنعت الیوم سلطت علی نفسک مائۃ الف سیف، ان ہذا فقیہ اہل العراق ہذا فقیہ اہل المشرق۔ — تم نے یہ آج کیا کیا؟ اپنے اوپر ایک لاکھ تلواریں تم نے کھچوالیں - یہ عراق کا فقیہ ہے، یہ تمام اہل مشرق کا فقیہ ہے (جسکو تم نے پٹوایا ہے)۔

اور صرف عباسی عہد میں امام کی جلالت قدر کا یہ حال تھا - بنی اُمیہ کے عہد میں امام صاحب جب کوفہ سے فرار ہو کر مکہ معظمہ تشریف لیگئے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئیگا، تو دیکھنے والوں نے آپکو اسلامی دنیا کے اس

مرکز میں اس شان میں دیکھا تھا۔ مشہور محدث جلیل عبداللہ بن المبارک کا بیان ہے۔

رأیت ابا حنیفۃ جالساً فی المسجد الحرام یفتی اھل المشرق والمغرب والناس یومئذ ناس یعنی الفقہاء الکبار وخیار الناس حضور۔

میں نے مسجد حرم میں ابو حنیفہ کو دیکھا کہ مشرق و مغرب کے لوگوں کو فتوے تیار ہے ہیں، اور بڑے بڑے لوگ اس وقت معمولی آدمیوں کی طرح سامنے موجود رہتے تھے۔ بڑوں سے مراد بڑے بڑے فقہاء، اور برگزیدہ لوگ ہیں۔

۱- امام صاحب کی شہادت کے مشہور اسباب

لطف یہ ہے کہ عام تاریخوں میں امام صاحب کی سوانح عمریوں میں ان دردناک واقعات کا ذکر بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ آخران حکومتوں کا طرز عمل حضرت امام کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ تو نہایت سادگی کے ساتھ اس کا جواب دیدیا جاتا ہے کہ ہر دو حکومتوں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ قضا کا عہدہ قبول کریں لیکن آپ نے انکار کیا۔ نوکری سے اس معمولی انکار کی یہ شدید سزائیں تھیں جو آپکو دی گئیں۔ اولاً تو یہی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر قاضی ہونا ایسی کون سی گناہ کی بات تھی جس سے امام صاحب نے اس حد تک اجتناب روا رکھا کہ کوڑے کھائے، لٹکائے گئے، بازار میں اپنا گشت کرانا پسند کیا، بالآخر مرنے ہی پر آمادہ ہو گئے اور بالآخر اس انکار کی وجہ سے جام شہادت بھی نوش فرمالیا۔ جہاں تک اسلامی روایات کا اقتضاء ہے قضا و فصل خصومات صرف یہی نہیں کہ مباح اور جائز کام ہے، بلکہ دین کے فرائض میں سے ہے، قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کے بھیجنے کی ایک بڑی غرض یہ بھی تھی کہ انسانوں کے باہمی جھگڑوں کو وہ آکر چکائیں، جیسا کہ وارد ہے۔

کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین ومنذرین وانزل

لوگ ایک ہی گروہ تھے، پھر خدا نے پیغمبروں کو مژدہ سناتے ہوئے اور دھمکاتے ہوئے بھیجا اور ان کے

معہم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ۔ — ساتھ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کتاب اتاری کہ لوگ باہم جن باتوں میں جھگڑ رہے تھے ان میں فیصلہ کریں۔

داؤد پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ:-

یاداؤد انا جعلناك خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس۔ — اے داؤد ہم نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

اور پیغمبروں کے سوا خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر اس کا حکم دیا گیا کہیں فرمایا گیا:-

انا انزلنا الیك الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراك اللہ و لاتکن للخائنین خصیماً۔ — اے پیغمبر ہم نے تم پر کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے، تاکہ لوگوں کے درمیان فیصلے اس طرز پر کرو جیسا خدا تمہیں سمجھائے اور خیانت کرنے والوں کی طرف سے پیروی نہ کرو۔

دوسری جگہ حکم ہے:-

وان احکم بینہم بما انزل اللہ — اور اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کرو۔

قضاء اور داورسی پر عام لوگوں کو ابھارا گیا:-

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ ان اللہ کان سمیعا بصیرا۔ — تمہیں خدا حکم کرتا ہے کہ امانتوں کو ان تک پہنچاؤ جن کی امانتیں ہیں اور لوگوں میں جب فیصلے کرو، تو انصاف کے ساتھ کرو، اللہ تمہیں اچھی نصیحت کرتا ہے اور خوب سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔

بہرحال قضاء ایک ایسا کام ہے جسے پیغمبروں نے انجام دیا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جب تک اس دنیا میں رہے، فصل خصومات کا فرض انجام دیتے رہے۔ آپ کے حکم سے عرب کے مختلف حصوں میں قضاۃ روانہ کیے گئے

مثلاً یمن کی طرف حضرت معاذ بن جبل کو بھیجا گیا، مکہ معظمہ کیلئے عتاب بن اسید کو مقرر کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ آپ کے بعد خلفائے راشدین اس کام کو خود بھی کرتے تھے اور مختلف علاقوں کے قاضیوں کو مقرر کرکے بھیجا جاتا تھا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اسلام جبکہ کوئی انفرادی اور محض پوجا پاٹ دھرم نہیں تھا، بلکہ وہ ایک وسیع حاوی کامل زندہ دستور ہے جو بنی آدم کے شخصی خاندانی، قومی، اجتماعی عام انسانی معاشی و معادی دنیاوی و اخروی تمام شعبوں پر مشتمل ہے اور اسی لیے اسلامی مذہب کو سیاسی قوانین سے جدا نہیں سمجھا جاتا، صرف نظری حیثیت ہی سے نہیں، بلکہ اسلام آن واحد میں جس طرح ایک مذہبی تحریک تھا اسی طرح وہ ایک کامیاب سیاسی تحریک بھی تھا، اسی لیے ظہور اسلام کے ساتھ ساتھ اسلامی حکومت کی بنیاد بھی پڑ گئی، اور جوں جوں یہ مذہبی تحریک آگے بڑھی، اسلامی حکومت کا دائرہ بھی اسی کے ساتھ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ پھر کیا کوئی کسی حکومت کا تصور اس طور پر کرسکتا ہے جس میں عدل و انصاف اور لوگوں کے باہمی نزاعات اور حقوق کے تصفیہ کا کوئی سامان نہ کیا گیا ہو؟ حکومت کے لفظی معنی ہی یہ ہیں کہ قوت کے ذریعہ سے لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض حدیثوں میں اس عہدہ کے متعلق بعض دھمکیاں بھی موجود ہیں لیکن علما کا اس پر اتفاق ہے کہ انکا تعلق محض ان لوگوں سے ہی ہے جو محض دنیاوی اغراض سے خود کوشش کرکے اس عہدہ کو حاصل کریں، یا ان لوگوں سے ہے جو اس فرض کی انجام دہی کی قابلیت نہ رکھتے ہوں پھر بھی تنخواہ کے لالچ یا عزت کی ہوس میں اس خدمت کو اختیار کرلیں۔ ظاہر ہے کہ امام صاحب کو حکومت اس عہدہ کے قبول کرنے پر آمادہ یا مجبور کررہی تھی نہ کہ آپ اپنی خواہش سے اس عہدہ کو لینا چاہتے تھے۔ رہی یہ شق کہ امام صاحب میں اس عہدہ کی انجام دہی کی قابلیت نہ تھی۔ اگر ان میں نہ تھی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آج تک دنیا میں کوئی صحیح معنوں میں قاضی نہ ہوا، اور نہ شائد آئندہ ہوسکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ امام صاحب نے انکار کے وقت خود اپنے متعلق یہ ضرور فرمایا ہے کہ انی لا اصلح لذالك (میں اس کے لائق نہیں ہوں) بلکہ اس کے متعلق یہ لطیفہ بھی مشہور ہے کہ منصور نے جب جواب میں کہا کہ نہیں، تم اس کی صلاحیت رکھتے ہو تو امام صاحب نے فرمایا:-

یا امیر المومنین اذ اعلمت انی اصلح	امیر المومنین! جب آپکو معلوم ہے کہ میں اس خدمت کے لائق ہوں،
وسمعتنی اقول لا اصلح فقد ظہر منی الکذب	اور یہ بات خود مجھ سے آپنے سنی کہ میں اسکے لائق نہیں ہوں، تو
ولا یحل لک ان تستعملنی۔ کیف یحل لک	ظاہر ہے کہ میرا جھوٹ آپ پر کھل گیا۔ اب آپکے لیے کیسے جائز
ان تولی قاضیا علی امانتک وھو کذاب؟	ہے کہ مجھے اپنی امانت قاضی بناکر سپرد کردیں بجالیکہ میں جھوٹا ہوں

کہاجاتا ہے کہ اس منطقی چکر میں آکر منصور کچھ مبہوت سا ہو گیا اور بڑبڑانے لگا،

ان ھذا یغیر الکلام بانی کذا	یہ شخص بات میں الٹ پھیر کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ میں یہ بولا وہ یہ بولا

لیکن علمی حیثیت سے امام صاحب کے اس بیان کا کیا وہ مطلب ہو سکتا ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے؟ جیسا کہ میں نے کہا اگر امام صاحب میں قاضی ہونیکی صلاحیت نہیں تھی تو ان کے بعد پھر آدم کی اولاد میں کس کا جگر ہے جو اسکا مدعی ہو؟ یقیناً آپکے بیان کا وہ مقصد نہیں ہے جو بظاہر خیال کیا جاتا ہے۔ اصل واقعات اور اس مکالمہ کے تمام اجزاء جب آپکے سامنے پیش کیے جائینگے اس وقت خود کھل جائیگا کہ اس فقرہ سے آپکی اصلی غرض کیا تھی۔

بہر حال اس وقت تو میں صرف اسقدر کہنا چاہتا ہوں کہ بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ امام صاحب نے واقعی اپنی عدم صلاحیت کی بنا پر عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا تھا، تو اس کے بعد بجائے چھوڑ دینے کے ان حکومتوں کو خواہ مخواہ اسکی کیا ضرورت تھی کہ آپکو اس نوکری پر مجبور کریں، اور اس حد تک مجبور کریں کہ شاید نوکری پر جبر و اکراہ کی تاریخ میں اسکی نظیر موجود نہ ہو؟ یقیناً جب ایک شخص اپنے کو کسی خدمت کے لائق نہیں قرار دیتا تو اس کو مجبور کرنا، دھمکانا، جیل دینا، مارنا، آخر میں مار ڈالنا، ایک مسلمان کا تو کیا شاید کسی صحیح العقل انسان کا بھی کام نہیں ہو سکتا۔ اور پھر یہ کسی ایک آدمی کے متعلق تو تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ وہ پاگل تھا اور جنون میں امام صاحب کے انکار کی اسنے یہ سزائیں تجویز کیں۔ لیکن یہ ایک حکومت کا تو واقعہ نہیں ہے۔ یہی سلوک دوسری حکومت کا بھی آپکے ساتھ ہوا۔ کیا آخر سب کے سب پاگل اور مجنون تھے؟ ماسوا اس کے قضا کے عہدہ سے انکار کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آپ اسلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے۔ شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ منکرین کی فہرست پچاسوں سے متجاوز ہو سکتی ہے۔

لیکن اس قسم کا برتاؤ ان ہی حکومتوں نے آخر دوسرے منکروں کے ساتھ کیوں نہیں کیا؟ جہاں تک تلاش و تتبع سے معلوم ہوتا ہے، اس انکار کے بعد یا تو ان لوگوں کو معافی دی گئی، یا تھوڑا بہت اصرار کیا گیا۔ لیکن جب رضامندی نہیں پائی گئی تو حکومت نے بھی زیادہ پیچھا نہیں کیا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں جن لوگوں کے متعلق تاریخوں میں شدت و اصرار کا ذکر پایا جاتا ہے، غور کرنے سے وہاں بھی تشدد و اصرار کی وجہ نفس ان کا انکار نہ تھا بلکہ اسکی تہ میں کچھ اور اسباب تھے۔ مگر یہ ہمارا موضوع نہیں ہے، ورنہ اسکی تفصیل بھی بتائی جاسکتی تھی۔ پھر یہ بھی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ قضا کی خدمت اگر کوئی اسی درجہ کا گناہ کبیرہ تھا کہ اس سے کنارہ کش ہونے میں موت تک کی بازی لگائی جاسکتی ہے، اور جیسا کہ امام صاحب سے راویوں نے بیان کیا ہے کہ اس "عہدہ" کے قبول کر لینے کے انجام کی تعبیر آپ مقامع من الحدید فی الآخرۃ سے کرتے تھے، یعنی آپکا خیال تھا کہ اگر میں حکومت کی اس درخواست کو قبول کرونگا تو آخرت میں میرے لیے صرف لوہے کے گرز ہونگے، اور اسی لیے لوگوں کے سمجھانے پر آپ نے ابن ہبیرہ گورنر بنی اُمیہ کی ضرب تازیانہ کے متعلق فرمایا۔

ضربہ فی الدنیا اسہل علی من مقامع من الحدید فی الآخرۃ

ابن ہبیرہ کی مار دُنیا میں کھا لینا یہ مجھ پر زیادہ آسان ہے آخرت کے آہنی گرزوں سے۔

اگر صرف حکومت کی نوکری، یا "عہدہ قضا" کی سزا آخرت میں امام صاحب کے نزدیک یہ تھی تو پھر ان کے اکثر و بیشتر شاگردوں نے خود انکے سامنے بھی اور انکے بعد بھی اتنے بڑے گناہ کبیرہ کو کیوں اختیار کیا؟ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک درجن سے زیادہ آدمی آپکے براہ راست شاگردوں میں وہی لوگ ہیں جنھوں نے قضا کی خدمت قبول کی۔ حتیٰ کہ آپکے شاگرد رشید امام ابو یوسف تو تاریخ اسلام کے سب سے پہلے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ہوئے۔ اور امام محمد بن حسن شیبانی کی عمر کا بیشتر حصہ اگرچہ تالیف و تدوین میں گذرا، لیکن زندگی کے آخری دنوں میں وہ بھی قاضی ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان دونوں بزرگوں کے سوا حسن بن زیاد، حفص بن غیاث وغیرہ جیسے جلیل القدر ائمہ نے ساری زندگی قضا میں گذاری۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ وہی لوگ جو امام صاحب کے

متعلق یہ نقل کرتے ہیں کہ محض خدمت قضا سے انکار کی وجہ سے آپ کو شہید کیا گیا وہی ان کے شاگردوں کے تذکروں میں مختلف پیرایوں میں یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو امام صاحب نے ہی قضا و افتاء کے لیے تیار کیا تھا۔ بلکہ بعضوں کے ذکر میں تو یہاں تک ہے کہ امام صاحب نے انکے متعلق پیشگوئی بھی فرمائی تھی کہ تم قاضی بنائے جاؤ گے۔ اسی بنیاد پر قاضی ابو یوسف کا وہ مشہور لطیفہ بیان کیا جاتا ہے کہ قاضی القضاۃ ہونے کے بعد ہارون رشید کے مائدہ (کھانے کی میز) پر ان کے آگے ہارون نے یہ کہتے ہوئے فالودہ کا پیالہ بڑھایا جو پستہ کے روغن میں تیار کیا گیا تھا۔

کل منها فلیس فی کل یوم یعمل لنا مثلها۔ — اسے نوش کیجیے، ایسا ہمارے یہاں ہمیشہ تیار نہیں ہوا کرتا۔

قاضی ابو یوسف فالودہ کا پیالہ ہاتھ میں لے کر کھاتے جاتے تھے اور کچھ ہنستے جاتے تھے۔ رشید نے پوچھا کہ ہنسنے کی کیا بات ہے؟ آپ نے فرمایا کہ "ایک پُرانا قصہ اپنی زندگی کا اس وقت یاد آیا۔ میرے والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ سرپرست میری صرف والدہ تھیں۔ کچھ بڑا ہوا تو ماں نے مجھے ایک دھوبی کے یہاں نوکر رکھا دیا۔ لیکن میرا جی دھوبی کے یہاں نہیں لگتا تھا اور بھاگ بھاگ کر میں امام ابوحنیفہ کے حلقہ میں آجاتا۔ پیچھے سے والدہ آتیں اور ہاتھ پکڑ کر مجھے حلقہ سے اٹھا لیتیں اور گھسیٹ کر دھوبی کے پاس لے جاتیں۔ آخر ایک دن والدہ امام صاحب کے پاس خود آئیں اور فرمایا کہ دیکھیے تو اس بچہ کو کیا ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپکے سوا اسکو کوئی اُستاد ہی نہیں ملتا۔ حضور یہ بچہ یتیم ہے۔ میں بڑی مشکل سے سوت کات کات کر اسکی پرورش کرتی ہوں، چاہتی ہوں کہ خود بھی آپ پیسہ دو پیسہ کمائے۔ حضرت امام نے اس پر میری ماں کو سمجھایا اور اس وقت خدا جانے کون سا وقت تھا کہ امام صاحب کی زبان مبارک پر یہ فقرہ جاری ہو گیا:

دعیہ یا رعنا فانہ یتعلم اکل الفالوذج بدھن الفستق (ص۲۰۱ مفتاح و مناقب موفق) — بیوی صاحبہ اس بچہ کو چھوڑ دیجیے یہ روغن پستہ میں تیار کیے ہوئے فالودہ کے کھانے کا علم سیکھ رہا ہے۔

آج امام کے اس فقرہ کی تعبیر پا رہا ہوں اس پر بے ساختہ ہنسی آگئی"۔ ہارون کی آنکھ سے یہ سن کر آنسو جاری ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ امام صاحب کا یہ فقرہ امام ابو یوسف کے قاضی ہونے کی طرف اشارہ تھا۔ بلکہ اسکے سوا ایسی کتابوں میں نہ صرف قاضی ابو یوسف بلکہ آپکے دوسرے شاگرد جو قاضی ہوئے انکے متعلق بھی امام صاحب کی پیشگوئیاں نقل کی جاتی ہیں مثلاً کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے حلقۂ درس میں کبھی کبھی فرماتے۔

هؤلاء ستة وثلاثون رجلا منهم	یہ چھتیس آدمی ہیں، جن میں اٹھائیس قاضی ہونے کی صلاحیت
ثمانية وعشرون يصلحون للقضاء و	رکھتے ہیں، چھ مفتی ہونے کے لائق ہیں، اور دو
ستة يصلحون للفتوى و اثنان ابويوسف	یعنی ابو یوسف اور زفر تو قاضیوں کی اور مفتیوں
وزفر يصلحان لتاديب القضاة و ارباب	کی تربیت و تعلیم کے قابل ہیں۔
الفتوى (ص ۲۳۶ مناقب)	

حماد بن دلیل کا تذکرہ درج کرتے ہوئے تو صاحب "جواہر مضیئہ" نے یہ لکھ کر کہ ا۔

احد الاثنى عشر من اصحاب الامام	یہ امام کے ان بارہ شاگردوں میں سے ایک ہیں جنکے متعلق امام
الذين اشار اليهم انهم يصلحون للقضاء	صاحب نے اشارہ فرمایا تھا کہ قاضی بننے کے لائق ہیں۔

ان تمام شاگردوں کی فہرست درج کر دی ہے اور وہ یہ ہے ا۔

قاضی ابو یوسف، قاضی اسد بن عمر، قاضی حسن بن زیادہ، قاضی نوح بن مریم، قاضی نوح بن دراج، قاضی عافیہ، قاضی علی بن ظبیان، قاضی علی بن حرملہ، قاضی حماد ا

امام صاحب کے ایک تلمیذ نوح بن ابی مریم ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں امام صاحب سے جہاں اور مسائل دریافت کرتا ان ہی کے ساتھ زیادہ تر قضاء کے مسائل ہوتے۔ آخر ایک دن امام صاحب نے فرمایا ا۔

یانوح تدق باب القضاء (ص ۱۱ موفق)	نوح تم قضاء کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہو۔

پھر جب یہ اپنے وطن مرو واپس ہوئے تو واقعی قضاء کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ انھوں نے امام صاحب کو اسکی اطلاع دی جسکے جواب میں بجائے اس کے کہ ان کو امام صاحب منع فرماتے (اور انکے خیال میں یہ کوئی مذہبی جرم ہوتا تو قطعاً منع کرتے) آپنے ارقام فرمایا:۔

من ابی حنیفۃ الی ابی عصمۃ ورد کتابک	ابوحنیفہ کی طرف سے یہ خط ابو عصمہ کے نام ہے۔
ووقفت علی جمیع ما فیہ وقلدت امانۃً	تمہارا خط ملا۔ جو کچھ اس میں تھا واقف ہوا۔ تم نے
عظیمۃ۔	ایک بڑی امانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے۔

آگے چند نصیحتوں کے بعد استعفاء کی رائے دینے کے بجائے ایک مسودہ بحث عہدۂ قضاء کی متعلق لکھی، جسنے بطور "یادداشت" اور "اساسی دستور" کے "حنفی فقہ" کے ایک اہم جز کی حیثیت حاصل کر لی۔ اس کے سوا امام صاحب کا ایک طویل "وصیت نامہ" قاضی ابو یوسف کے نام سے عام کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے جسکے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب قاضی ابو یوسف کو قاضی بننے پر آمادہ کر رہے ہیں، اور اس کے بعد انکو کیا کرنا چاہیے اسکے متعلق تفصیلی ہدایتیں انھوں نے درج کی ہیں۔ عہدۂ قضاء کے ان دونوں "اساسی دستوروں" کے متعلق میں آئندہ تفصیلی بحث کرونگا۔ اس وقت مجھے صرف یہ دکھانا تھا کہ یقیناً یہ خیال غلط ہے کہ بالکلیہ امام صاحب "عہدۂ قضاء" کو ناجائز ٹھیراتے تھے جسکی تائید گذشتہ بالا شہادتوں سے ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب قضاء کی خدمت گناہ کبیرہ تھی تو پھر اپنے شاگردوں کو بجائے منع کرنے کے امام صاحب نے اور انکی ہمت افزائیاں کیوں فرمائیں؟ اور ایک حضرت امام کے تلامذہ کیا، تقریباً آج بارہ سو سال سے اسلامی ممالک کے اکثر حصوں خصوصاً مشرقی علاقوں میں زیادہ تر منصب قضاء پر عموماً وہی لوگ سرفراز رہے جو غالی حنفی اور امام اعظم کے مکتب خیال کے برگزیدہ علماء تھے۔ کوئی باور کر سکتا ہے کہ اگر سرے سے قضاء کی خدمت امام صاحب کے نزدیک آہنی گرز کی مستوجب تھی تو پھر انکے ایسے زبردست متبعین، کیا ایک سکنڈ کے لیے بھی اس کام کے لیے جرأت کر سکتے تھے؟

حقیقت یہ ہے کہ "اسلامی تاریخ" کے ایسے اہم واقعہ کو اب تک جس بے پروائی کے ساتھ دیکھا گیا، شاید اسکی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ حالانکہ واقعات موجود تھے۔ اسباب کا پتہ آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔ لیکن امام صاحب کی وفات کی وجہ ابتدا میں کسی نے انکار قضاء درج کی، آئندہ بے سمجھے بوجھے لوگ اسکو نقل کرتے چلے آئے۔ اگرچہ جہاں تک میری تلاش و تجسس کا تعلق ہے سیکڑوں واقعات کے درمیان میں نہایت سرسری طور پر بعض کتابوں میں یہ فقرہ بھی بعضوں کے قلم سے کہیں کہیں نقل ہو گیا ہے:۔

لکنهم اختلفوا فی السبب فقیل کما قدمنا انه ابی القضاء فعمل به کما حکیناه وروی ان ابراهیم بن عبد الله خرج بالبصرة یدعی الخلافة فبلغ المنصور انه والاعمش کتبا الیه فکتب علی لسان ابراهیم کتابا وارسله الیه فاخذ الکتاب وقبله فاتهمه المنصور فی ذلک وسقاه السم واخضر وجهه ومات منه۔

(کردری ص ۲۱ ج ۲)

لیکن سبب کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک سبب تو وہی بیان کیا جاتا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ آپنے قاضی ہونے سے انکار کیا اسکی سزا میں یہ سلوک آپکے ساتھ کیا گیا۔ دوسری روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ابراہیم بن عبداللہ نے بصرہ میں علم بغاوت خلافت کے مدعی ہو کر بلند کیا منصور کو یہ خبر پہنچی کہ ابو حنیفہ اور اعمش نے ابراہیم کو کچھ لکھا ہے منصور نے جعلی طور پر ابراہیم کے نام سے ایک خط لکھوا کر امام صاحب کے پاس بھیجا۔ امام نے اس خط کو لیا اور بوسہ دیا۔ منصور نے اس بنیاد پر آپ کو متہم ٹھیرایا، اور اسکی سزا میں زہر پلوا دیا جسکی وجہ سے آپکا چہرہ نیلا پڑ گیا اور اسی سے انتقال ہوا۔

اسی کے قریب قریب بعض کتابوں میں ایک اور بات ملتی ہے۔ حالانکہ حنفی مذہب کے ایک جلیل القدر امام کی یہ روایت تھی لیکن نہ معلوم کیوں محض سرسری طور پر بعض کتاب کے گوشوں میں اسے درج کیا گیا۔ صدر الائمہ علامہ ابو المؤید موفق الدین المکی اپنے مناقب میں لکھتے ہیں کہ سمرقند سے امام ابو حفص عمر بن احمد النسفی نے اور بخارا سے محمد بن حسن المختنی و حماد بن ابراہیم نے مجھے یہ لکھ کر بھیجا کہ امام ابو عبداللہ محمد بن ابی حفص

کبیر جو متقدمین علماء احناف کے بڑے رکن ہیں، ان سے متصل سند کیساتھ یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ۔

دخل حسن بن قحطبة احد قواد ابی جعفر المنصور علی ابی حنیفة فقال له انا ممن تعلم وعملی لا یخفی علیک۔ فهل لی من توبة؟ قال نعم۔ فقال ماهیه۔ قال ان یعلم الله عز وجل نیتک نیة صادقة انک نادم علی مافعلت واخذت، وانک اذا خیرت بین ان تقتل مسلماً او تقتل تختار قتلک علی قتله، وتجعل الله عز وجل علی نفسک عهداً ان لا تعود الی شیء ماکنت فیه، فان وفیت فهی توبتک۔ فقال الحسن فانی قد فعلت ذلک وعاهدت الله تعالی ان لا اعود فی شیء ماکنت فیه من قتل المسلمین۔ فکان فی ذالک الی ان ظهر ابراهیم بن عبد الله بالبصرة من اهل البیت۔ فارسل الیه ابو جعفر وامره بالمسیر الیها۔ فجاء الی ابی حنیفة رحمة الله فقال یا ابا حنیفة شرّ امانی

ابو جعفر منصور کا ایک جرنیل جس کا نام حسن بن قحطبہ تھا امام ابو حنیفہ کے پاس آیا اور بولا جس گروہ سے میرا تعلق ہے آپ جانتے ہی ہیں اور جو کچھ میرا کاروبار رہا ہے اس سے بھی آپ واقف ہیں۔ پھر کیا میری توبہ کی بھی کوئی شکل ہو سکتی ہے؟ امام نے فرمایا ہاں۔ اس نے کہا کیا صورت ہے؟ فرمایا اگر اللہ تعالیٰ کے سامنے تم سچی نیت کے ساتھ حاضر ہو جاؤ اور واقعی تم کو اپنے پچھلے کرتوتوں پر سچی ندامت ہو جو کچھ تم نے کیا اور لیا دیا ہے اس سے شرمندہ ہو اور اس طرح نادم و شرمندہ ہو کر اب اگر تمہیں کسی مسلمان کے قتل کرنے کا اور خود اپنے قتل ہونے کا اختیار دیا جائے، تو تم اپنے قتل ہونے پر آمادہ ہو جاؤ، اور اللہ سے اسکا معاہدہ کرو کہ جس حال میں تم تھے اب آئندہ اسکی طرف واپس نہ ہوگے، تم نے اگر اپنے اس معاہدہ کو پورا کر دیا تو تمہاری بھی توبہ ہو جائیگی۔ حسن نے کہا اچھا تو میں یہی کرتا ہوں اور اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے قتل کا کبھی ارتکاب نہ کرونگا۔ حسن اسی حال میں تھا کہ ابراہیم بن عبد اللہ کا ظہور بصرہ میں ہوا جو اہلبیت میں سے تھے۔ ابو جعفر نے حسن کو کہلا بھیجا کہ فوراً ابراہیم کے مقابلہ کیلیے بصرہ روانہ ہو جاؤ۔ حسن اس حکم کے بعد ابو حنیفہ

الخلیفة بکذا وکذا۔ فقال فقد جاءك اوان
توبتك۔ اما انت فقد عاهدت الله
ما قد علمت۔ فان وفیت له ارجوان یتوب
الله علیك۔ وان عدت اخذت بما
مضی من ایامك وما بقی۔ فقال الحسن
اللهم انی بما عاهدت لك۔ فاوصی
وتهیأ للقتل ودخل علی ابی جعفر فقال
له واستعفی واعتل۔ فلم یقبل منه۔
فقال یا امیر المومنین انی لست بسائر
الی هذا الوجه۔ ان کان لله طاعة فمن
قتلت فی سلطانك فلی منه اوفر الحظ
وان کان معصیة فحسبی ما قتلت۔
فغضب ابوجعفر من ذالك ووثب
اخوه حمید وقال یا امیر المومنین
انا انکرناه منذ سنة وتخوفنا علیه ان
یکون قد خالط۔ فانا اسیر وانا احق
بالفضل منه۔ فسار حمید وقال ابو
جعفر لاهل ثقاته تعاهدوا الحسن علی
من یدخل من هؤلاء الفقراء (الفقهاء)

کے پاس آیا اور بولا بڑی بُری خبر ہے۔ خلیفہ نے ایسا ایسا
مجھے حکم دیا ہے۔ امام نے فرمایا! دیکھو تیری توبہ کا وقت آگیا
تو نے خدا سے جو معاہدہ کیا ہے اسے تو جانتا ہے، اگر
اب اس عہد کو پورا کریگا تو میں اُمید کرتا ہوں کہ حق
تعالیٰ تیری توبہ قبول فرمائینگے اور اگر پھر تم اسی حالت
کی طرف پلٹ گئے اور اسی پیشہ کو اختیار کیا، جو گذشتہ
زمانہ میں تم کرتے تھے، تو پچھلے گناہوں میں بھی پکڑے
جاؤگے اور اگلے گناہوں میں بھی۔ حسن نے کہا اے خدا
جو میں نے تجھ سے عہد کیا ہے اسے پورا کرتا ہوں۔ اس کے
بعد اس نے وصیت کی اور خود قتل ہونیکے لیے تیار ہو کر ابو
جعفر منصور کے دربار میں حاضر ہوا اور اس کام سے اس نے
معافی چاہی۔ کچھ عذر پیش کیا۔ لیکن ابوجعفر نے قبول نہیں
کیا۔ حسن نے کہا امیرالمومنین! اس مہم پر میں تو کبھی روانہ نہیں
ہو سکتا، کیونکہ جن لوگوں کو اب تک میں آپکی حکومت کے زیر فرمان
قتل کر چکا ہوں اگر یہ کوئی نیک کام تھا تو اس نیک کام کا ایک
بڑا حصہ مجھے حاصل ہو چکا ہے۔ اور اگر گناہ تھا تو حضور
بس اتنے انسانوں کا قتل کرنا میرے لیے کافی ہے۔ ابوجعفر
یہ سنکر غضب ناک ہوا۔ اتنے میں اُچک کر حسن کا بھائی
منصور کے سامنے آیا اور بولا کہ حضور اس شخص کی

او من یدخل علیہ ومن ھذا الذی یفسد علینا ھذا الرجل - فاخبروہ ان یدخل علی ابی حنیفۃ رحمہ اللہ فدعاہ بعلۃ شئ فسقاہ فمات رحمہ اللہ وسقی الحسن فعالج نفسہ فنجا ۱۰۳

حالت تقریباً ایک سال سے ہم لوگ بگڑی ہوئی پا رہے ہیں اور جب سے ہم لوگوں کو اندیشہ تھا کہ اسکے اندر کچھ خلل پیدا ہو گیا ہے - بہر حال میں اس مہم پر روانہ ہوتا ہوں اور بزرگی کا میں اس سے زیادہ حقدار ہوں - حمید یہ کہکر مہم پر روانہ ہوا - منصور نے اپنے معتبر درباریوں سے کہا کہ اس بات کی ٹوہ لگاؤ کہ شہر کے ان فقیہوں میں سے کس کے پاس اسکی آمد رفت ہے یا کون اسکے پاس آتا جاتا ہے اور یہ کون ہے جو ہماری حکومت میں بگاڑ و فساد پیدا کرتا ہے - لوگوں نے اطلاع دی کہ اس کا تعلق امام ابو حنیفہ سے ہے یہ سنکر منصور نے امام صاحب کو ایک بہانہ سے بلایا اور زہر پلایا جسکی وجہ سے آپ کا انتقال ہوا -

بعض کتابوں میں امام صاحب کے مشہور شاگرد زفر بن ہذیل کی زبانی ایک اور روایت بھی اس سلسلہ میں نقل کی جاتی ہے -

عن زفر بن ھذیل قال کان الامام یجھر بالکلام ایام ابراھیم جھاراً اشد یداً فقلت ما انت بمنتہٍ حتی توضع الحبال فی اعناقنا فلم یلبث یسیراً حتی جاء کتاب المنصور الی عیسی بن موسیٰ ان احمل ابا حنیفۃ الینا فحمل بغداد فعاش خمسۃ عشر یوماً ثم سقاہ السم فمات رحمۃ اللہ علیہ ص ۱۷ موفق -

زفر کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہ ابراہیم کی بغاوت کے زمانے میں علانیہ شدت و زور شور کیساتھ اسکی تائید میں باتیں کیا کرتے تھے (لوگوں کو ان کا ساتھ دینے پر ابھارتے تھے) - میں نے عرض کیا شائد آپ اس طرز عمل سے اس وقت تک نہ رکینگے جب تک کہ ہماری سب کی گردنوں میں رسیاں نہ پڑ جائیں - میری اس گفتگو کے چند ہی دنوں بعد منصور کا فرمان عیسیٰ بن موسیٰ کے نام آیا کہ ابو حنیفہ کو فوراً ہمارے پاس روانہ کرو - امام کو بغداد روانہ کر دیا گیا - پندرہ دن آپ وہاں رہے ہونگے کہ ایک دن آپکو زہر پلا دیا گیا - اسی میں وفات ہوئی -

یافعی نے اس پر اضافہ کیا ہے (و یامر بالخروج معہ ۳۰۸) - یعنی امام صاحب لوگوں کو ابراہیم کا ساتھ دینے پر اُبھارتے تھے۔

امام صاحب کی شہادت کے اسباب میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض بعض تاریخوں میں یہ چند بیانات بھی پائے جاتے ہیں - لیکن عام طور سے مورخین نے چونکہ انکار قضاء کے سبب ہی کو اُجاگر کرکے بیان کیا اس لیے زیادہ تر آپکی وفات کی وجہ میں اسی نے شہرت حاصل کی - لیکن ان بیانوں سے بھی زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ عباسی حکومت کے مظالم کا تعلق اس سیاسی معاملہ سے تھا - مگر بنی اُمیہ کے عہد حکومت میں جو آپ پر زیادتیاں کی گئیں اُنکے متعلق تو اتنی تصریح بھی نہیں ملتی - بلکہ ابن ہبیرہ کے مظالم کی داستان جہاں کہیں بیان کی گئی اس میں بس "حکومت کی نوکری" سے انکار ہی کو واحد سبب قرار دیا گیا ہے - کہا جاتا ہے کہ پہلے ابن ہبیرہ نے آپ پر قضاء پیش کی - جب اس سے انکار کیا تو آپ کو بیت المال کا افسر مقرر کرنا چاہا اس پر بھی راضی نہ ہوئے تو تسجیل (رجسٹراری) یعنی گورنر کے احکام پر مہر لگانے کا کام آپکو پیش کیا گیا - جب اس سے بھی آپ نے انکار کیا تب اس نے آپکے ساتھ وہ تعدیاں کیں جنکا اجمالاً ذکر پہلے ہی آچکا ہے اور آئندہ تفصیل سے آئیگا - گویا سب کا حاصل یہ ہوا کہ بنی اُمیہ کی حکومت سے آپ کا کوئی سیاسی اختلاف سرے سے تھا ہی نہیں - اور عباسی دور میں آپ کا حکومت وقت سے اختلافی تعلق صرف ایک موقعہ پر ثابت ہوتا ہے یعنی جب ابراہیم بن عبداللہ نے منصور کے خلاف علم بلند کیا - گویا ستر سال کی زندگی میں ایک موقع ہے جہاں آپ نے اس سیاسی مسئلہ سے دلچسپی لی - گویا لے دے کر آپکا سب سے بڑا سیاسی کارنامہ ساری زندگی میں ایک ہی ہے - امام صاحب کی سوانح عمریوں یا دوسری تاریخی کتابوں کے پڑھنے سے امام کی سیاسی زندگی کے متعلق جو اثر عام طور سے دماغوں میں باقی رہ جاتا ہے وہ صرف یہی ہے - لیکن کیا یہی واقعہ بھی ہے؟

حیرت ہوتی ہے کہ امام صاحب کے ساتھ دونوں حکومتوں کی جانب سے ایسے جگر شگاف دل ہلا دینے والے مظالم توڑے جاتے ہیں اور لوگ اسکو محض کسی مقامی امیر یا کسی خلیفہ وقت کے وقتی عتاب کا نتیجہ یا راج ہٹ

کا نتیجہ قرار دے لیتے ہیں۔ حالانکہ "واقعات" موجود تھے۔ لیکن انکو باہم ایک دوسرے سے مربوط کرکے نتیجہ نکال لینے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔

۲۔ امام صاحب کے عہد کی سیاسی تاریخ

امام صاحب کی "شہادت" کے متعلق جن اسباب و وجوہ کا تذکرہ تاریخ میں صراحۃً کیا گیا ہے وہ تو یہی تھے جو قارئین کرام نے ملاحظہ فرمالیے۔ اب میں آپکے سامنے چند واقعات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہوں جن سے نہ صرف امام صاحب کی "شہادت" کے حقیقی اسباب پر روشنی پڑتی ہے بلکہ امام اعظم کی اس عظیم قربانی پر جو انقلابی نتائج مرتب ہوئے انشاءاللہ تعالیٰ وہ بھی آپکے سامنے آجائینگے۔

اب تک اس سلسلہ میں جن باتوں کا میں نے ذکر کیا ہے، ان میں یہ دو واقعے بھی ہیں۔ ایک یہ کہ عباسی حکومت کے مقابلہ میں جب ایک علوی امام حضرت ابراہیم نے علم بغاوت بلند کیا تو امام صاحب پوشیدہ طریقہ ہی سے نہیں بلکہ علانیۃً وجہراً انکی اعانت پر لوگوں کو آمادہ فرماتے تھے۔ دوسرے یہ کہ عباسی حکومت کا سب سے بڑا مشہور جنرل حسن بن قحطبہ محض آپکے مشورہ سے متاثر ہوکر حضرت ابراہیم کے مقابلہ میں جنگ کرنے سے رُک گیا تھا۔

اسی کے ساتھ کتابوں میں عام طور پر یہ واقعہ بھی درج ہے کہ بنی اُمیہ کے زمانے میں ہشام بن عبدالملک خلیفہ کے مقابلہ میں جب حضرت زید بن علی نے خروج کیا تو اس وقت بھی امام صاحب حضرت زید کے طرفداروں میں تھے اور ایک خطیر رقم سے ان کی فوجی مہم میں امداد فرمائی۔ اس واقعہ کا تفصیلی تذکرہ آئندہ آئیگا۔

کم ازکم ان واقعات سے اتنا تو اب بھی ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب کے علم و زہد نے دین و ملت کی سیاسی ضرورتوں سے انکو بے حس بنا کر نہیں چھوڑ دیا تھا بلکہ حلقۂ درس، تسبیح و مصلی کے ساتھ ساتھ آپ کی نگاہیں بادشاہوں کے تخت اور حکومتوں کے اس طرز عمل پر بھی رہتی تھیں جس کا اثر اس پیغام پر پڑتا تھا جسے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں نے وراثتہً اس معاہدہ کے ساتھ پایا ہے کہ "جہاں تک ممکن ہوگا ہر قسم کے مصائب و آفات سے اسے بچاتے ہوئے ایک نسل دوسری نسل کو سونپتی چلی جائیگی"۔ اور اس میں حضرت امام کی تقلید کے ان مدعیوں کے لیے عبرت ہے، جو امام کی تقلید کو صرف آمین و رفع الیدین کے مسئلوں تک محدود کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ ان مسائل کی تنقیح و تنقید کے بعد ان کے ذمہ دین و ملت کا کوئی فرض باقی نہیں رہتا۔

امام کی ولادت باسعادت بنی اُمیہ کے اُس عہد میں ہوئی تھی جب سارا عالم اسلام ان کے خونچکاں مظالم سے تھرا رہا تھا۔ دُنیا کے ان متوالوں سے وہ سب کچھ سرزد ہو چکا تھا جسکی نظیر اسلام ہی کیا شاید تاریخ عالم میں موجود نہیں۔ فرات کے ساحل پر اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے اور ان کے خاندان کے پیاسے شہیدوں کے بہتے ہوئے لہو سے یہ اپنی حرص و آز کی پیاس بجھا چکے تھے۔ رسول کا منور و پاک شہر حرّہ کے واقعہ میں لوٹا جا چکا تھا اور اس بُری طرح لوٹا جا چکا تھا کہ جان و مال ہی نہیں بلکہ عصمتیاں حرم کی آبرو و ناموس تک کی پروا نہیں کی گئی۔ رسولؐ کی مسجد میں سعید بن المسیب کے سوا ایک زمانے تک نماز پڑھنے والا کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ اللہ کا گھر کعبہ تک بھی دنیا طلبی کی اُس بھٹی کی چنگاریوں سے نذر آتش ہو چکا تھا جو اس خاندان کے سینوں میں جل رہی تھی۔ خلافت اسلامی کے پہلے خلیفہ کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر بیت اللہ کی چوکھٹ پر اُن ہی کے ہاتھوں خاک و خون میں تڑپ چکے تھے۔ "ظالم الامتہ" حجاج کی بے پناہ تلوار لاکھوں مسلمانوں کی گردنیں معمولی معمولی باتوں میں اُڑا چکی تھی جن میں جلیل القدر صحابہ اور تابعین بھی شامل تھے۔

الغرض بنی اُمیہ اور انکے سنگدل و سیاہ سینہ ولاۃ (گورنروں) کی بدتمیزیوں کے اس بے پناہ طوفان نے ایک ایسا دہشت ناک مہیب منظر دُنیائے اسلام میں قائم کر دیا تھا کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر دم بخود تھا۔ منکرات دیکھے جا رہے تھے لیکن ہاتھ سے روکنے کی جرأت کسی کو کیا ہوتی ابڑے بڑوں کی زبانیں تک خاموش تھیں۔ یزید، ابن زیاد اور حجاج جیسے رسوائے زمانہ ہی نہیں بلکہ جو اُن میں نیکی اور حلم و بردباری میں

شہرت رکھتے تھے ان کے درباروں میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز صحابیوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا تھا اُسکا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ عبدالملک بن مروان (جو اپنی مذہبی زندگی میں خاص امتیاز رکھتا تھا) کے پاس بوڑھے اور نابینا صحابی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ مدینہ طیبہ سے چل کر دمشق صرف اس لیے آتے ہیں کہ واقعہ حرہ کے بعد انتقاماً مدینہ منورہ والوں پر جو ظلم توڑے جا رہے تھے ان کو بند کرنے کی درخواست کریں۔ اس وقت رسول اللہ کے پڑوسیوں پر زندگی کے تمام ذرائع بند کر دیے گئے تھے۔ ہر شخص گویا اپنے گھر میں قیدیوں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ رسولؐ کے صحابی اس پر رحم کی سفارش لیکر آتے ہیں اور خلیفہ عبدالملک سے کہتے ہیں:۔

یا امیرالمومنین ان المدینۃ حیث تری وھی طیبۃ سماھا النبی صلے اللہ علیہ وسلم واھلھا محصورون فان رأی امیرالمومنین ان یصل ارحامھم ویعرف حقھم فعل (ابن سعد)	امیرالمومنین! مدینہ منورہ جس حال میں ہے آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہ "طیبہ" (یعنی پاک شہر) ہے۔ یہ نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا رکھا ہے۔ اس کے باشندے آج کل قیدیوں کی طرح محصور ہیں۔ امیرالمومنین کو اگر صلہ رحمی کا خیال ہو اور انکو حق کو وہ پہچانیں تو ایسا کرنا چاہیے۔

پیغمبر کے ایک صحابی پیغمبر کے شہر کے بے قصور باشندوں، بچوں اور عورتوں پر رحم کی درخواست پیش کرتے ہیں لیکن بجائے سمجھنے کے عبدالملک کے سینہ میں غصہ کی آگ بھڑکنے لگی۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ حضرت چونکہ نابینا تھے اس لیے انکو اسکی ناراضی کا پتہ نہ چلا۔ آپ بار بار اسی بات کو دہرا رہے تھے۔ قریب تھا کہ انکے ساتھ بھی کوئی سخت واقعہ پیش آئے لیکن اتفاق سے دربار میں ان کے ایک شاگرد قبیصہ موجود تھے۔ انہوں نے حضرت کو خاموش کیا۔ ہاتھ پکڑ کر باہر نکال لائے اور حضرت کو سمجھانے لگے کہ

یا ابا عبداللہ ان ھؤلاء القوم صاروا ملوکا (ابن سعد)	حضرت یہ لوگ (بنی امیہ) اب بادشاہ بن گئے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ آپ کیا ابھی تک ان لوگوں کو واقعی مسلمانوں کا امیر اور خلیفہ ہی سمجھ رہے ہیں۔ یہ اپنے کو اب رسول کا جانشین نہیں سمجھتے بلکہ گذشتہ رومی اور ایرانی سلاطین کے نقش قدم پر چل کر انھوں نے اپنے کو بادشاہ بنالیا ہے۔ قبیصہ پر عبدالملک چونکہ بہت بھروسہ کرتا تھا اور یہ بات مشہور تھی اس لیے حضرت جابر نے یہ سن کر قبیصہ سے فرمایا:۔

فانہ لا عذر لک وصاحبک یسمع منک۔ — مگر تم کو کوئی عذر کا موقع حاصل نہیں ہے کیونکہ تمہارا صاحب تمہاری بات تو سنتا ہے۔

اس پر قبیصہ نے جو بات کہی اس سے ان خلفاء کے طرز عمل کی کیسی اچھی تشریح ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا:۔

یسمع ولا یسمع ما وافقہ یسمع (ابن سعد) — حضرت! وہ سنتا بھی ہے اور نہیں بھی سنتا ہے۔ جو بات منشا اور مرضی کے مطابق ہوتی ہے بس اسی کو سنتا ہے۔

مروانی خاندان کے پہلے خلیفہ کا یہ حال تھا۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بعد کے خلفاء جنھوں نے سلطنت ہی کی گود میں آنکھیں کھولی تھیں ملوکیت میں ان کا رنگ کتنا گہرا ہوتا چلا گیا ہوگا۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت کوفہ یعنی امام صاحب کے مولد کی تھی کہ اسی شہر میں مدت تک ابن زیاد اور اس کے بعد حجاج کی تلوار اپنے نیام سے باہر ہو کر بیکسوں اور مظلوموں کے سر پر مسلسل بیس سال تک انتہائی بے دردی کے ساتھ چلتی رہی۔ کوفہ والے کس حال میں تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے استاذ حضرت ابراہیم نخعی کو جب حجاج کی موت کی خبر پہونچی تو وہ سجدہ میں گر گئے اور بیان کیا جاتا ہے کہ انکی آنکھوں سے مسلسل خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب "لوہے کی عصا" سے ایسی حکومت قائم کی گئی تھی جس میں زبان سے کسی اصلاحی لفظ کا نکالنا اپنے خون سے کھیلنا تھا اور اسی لیے بڑے بڑے بڑوں کے پائے استقلال اپنی جگہ سے ہل کر بجائے کھڑے ہونے کے بیٹھنے کو ترجیح دے چکے تھے۔ خواجہ حسن بصری، ابن سیرین، ابراہیم نخعی، شعبی جیسے ائمہ عظام کے لیے

خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا (جسکی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے) - یہ واقعہ ہے کہ ایک خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ حکومت کی قہرمانیت و استبداد کے یہی لیل و نہار رہینگے تو آئندہ نسلوں میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جذبہ جسکی قرآنی تعلیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و خلفاء راشدین کے طرز عمل نے مسلمانوں میں پرورش کی تھی ہمیشہ کے لیے بجھ کر رہ جائیگا جس کا آخری مآل اسکے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ نبوت نے جو اسلامی نظام قایم کیا تھا محروم ہو کے ان غلام بادشاہوں اور انکے عمال و حکام کے ہاتھوں بتدریج مسخ ہوتے ہوتے درہم و برہم ہو کر رہ جاتا۔

غالباً حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ اپنی عمر کے اٹھارہویں سال میں تھے کہ اسلام کے متعلق وہی تجربہ جسکی شہادت تیرہ سو سال سے اسلامی تاریخ مسلسل ادا کر رہی ہے ظاہر ہوا - یعنی اسلام کی کشتی جب کبھی نزاکت کے آخری گرداب میں اس طرح پھنسی ہے کہ دیکھنے والوں نے ہمیشہ کے لیے اسکے ڈوب جانے کی پیشگوئی کی تو اچانک کسی غیبی لطیفہ نے ظاہر ہو کر انا لہ لحافظون کی توثیق کرتے ہوئے نا امیدی کی ان مایوسانہ پیش قیاسیوں کو ہمیشہ جھٹلا کر رکھدیا ہے - میرا مقصد یہ ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا بنی امیہ کے اپنی مردہ لاشوں میں سے جنھوں نے خواہ "سیاسی" طور پر جس قسم کی زندگی کا ثبوت دیا ہو لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں اکثر مردہ ہو چکے تھے، اور اس حد تک مردہ ہو چکے تھے کہ ان ہی اموی خلفاء میں سے ایک نے اپنی ایک ناپاک کنیز کو بحالت جنابت عبا اور عمامہ پہنا کر مسجد میں امامت کے لیے بھیجا اور بیچارے ناواقف مسلمانوں کو اسی بدمست و ناپاک عورت کے پیچھے نماز پڑھنی پڑی - لیکن "یخرج الحی من المیت" کی یہ عجیب شان ہے کہ ان ہی مردہ ضمیروں میں سے اس حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفہ کو اموی تخت کا وارث بنایا جسکی ایمانی زندگی نے نئے سر سے اسلامی نظام کے تمام شعبوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی - جیسا کہ میں نے عرض کیا امام صاحب کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا جس وقت عمر بن عبد العزیز نے خلافت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی - پہلی تقریر منبر پر ہو چکر انھوں نے جو کی اس کا سب سے اہم فقرہ یہ تھا کہ:-

لا طاعۃ لنا فی معصیۃ اللہ (ابن سعد) اللہ کی نافرمانی میں ہماری فرماں برداری کوئی نہ کرے۔

آزادی کا یہ پہلا منشور تھا جسکا بنی اُمیہ کے عہد میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی جانب سے پہلی دفعہ اعلان کیا گیا۔ تمام ظالم گورنر جنکے حالات سے وہ بخوبی واقف تھے ایک ایک کرکے ہٹا دیے گئے۔ ہر شخص کو حکم دیا گیا کہ "اسلامی نظام" میں جہاں جہاں جس قسم کی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے اور پوری قوت سے کی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساری زبانیں جن پر تلوار کے تانے چڑھائے گئے تھے کھل پڑیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر و اظہار حق کے جذبہ کا جو چراغ قریب تھا کہ بجھ جائے، پھر سینوں میں روشن ہوگیا۔ مشہور مدنی امام حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر کا مشہور تاریخی فقرہ۔

الیوم ینطق من کان لا ینطق (ابن سعد) اب وہ بولیں گے جو نہیں بول سکتے تھے۔

خلافت عمری کے اسی اعلان آزادی کا ترجمہ ہے۔ ایک طرف عمر بن عبد العزیز کے زمانہ میں لوگوں کو یہ آزادی میسر آئی، دوسری طرف ایک اور انقلاب کی ابتدا ان ہی کے زمانے سے شروع ہوئی۔ وہ یہ کہ بنی اُمیہ کی غیر اسلامی زندگی کا ایک اثر عام لوگوں پر یہ بھی پڑا تھا کہ شرعی علوم یعنی قرآن وحدیث اور ان سے مسائل استنباط کرنے کا عام رجحان جسے فقہ کہتے ہیں بہ تدریج کم ہوتا جاتا تھا کیونکہ ہمیشہ علوم کی ترویج واشاعت میں ضرورت کو بہت زیادہ دخل ہوتا ہے۔ لوگوں میں اسلامی زندگی گذارنے کا جب شوق ہی مردہ ہو چلا تھا تو ظاہر ہے کہ اسکی ضرورت بھی کم ہو رہی تھی۔ جیسا کہ خود امام صاحب کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے عام لوگوں کی توجہ شرعی علوم سے ہٹ کر شعر وشاعری ادب وغیرہ کی طرف مائل تھی دینی علوم میں سب سے زیادہ اہمیت ان مسائل کو حاصل ہوگئی تھی جن پر فلسفیانہ رنگ غالب تھا جسے اس زمانہ میں علم کلام کہتے تھے۔ گویا دین بھی ایک قسم کی ذہنی عیاشی کا ذریعہ بن گیا تھا۔ خود امام اعظم کا ابتدائی حال بھی یہی تھا جیسا کہ خود بیان کرتے ہیں:۔

کنت اعد الکلام افضل العلوم وکنت اقول ھذا الکلام فی اصل الدین (مناقب کردری)

ابتدا میں میرا حال یہ تھا کہ میں کلام کو تمام علوم میں سب سے بہتر علم خیال کرتا تھا کہ اس میں تو دین کی بنیادی گفتگو کی جاتی ہے۔

اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ جس قسم کی فطری ذکاوت و ذہانت سے کہ امام صاحب آئے تھے اُس نے ان فلسفیانہ موشگافیوں میں آپ کی دلچسپی کو اتنا تیز کر دیا تھا کہ

حتی صار أسانی ذلك منظوراً الیہ (مناقب)

امام صاحب اپنے زمانہ میں اس علم کے رئیس ہو گئے لوگوں کی نگاہوں کے مرکز بن گئے۔

تعلیمی سوانح کو بیان فرماتے ہوئے امام صاحب خود اپنے کلامی شوق کا اظہار ان الفاظ میں کرتے تھے

كنت رجلا اعطيت جدلا فی الكلام فمضی دهر فيه اتردد وبه (فاهم وعنه افاضل۔

میں دراصل ابتدا میں ایسا آدمی تھا جسے "علم کلام" میں مقابلہ و مجادلہ کا ذوق تھا۔ اس سلسلہ میں ایک زمانہ گذر گیا کہ اسی کے پیچھے میری تگ و دو تھی، اسی فن میں لوگوں سے مقابلہ کرتا اور چیلنج دیتا۔

جوانی کے اس شوقِ بے پروا میں آپ جب کوفہ کے میدان کو تنگ پاتے تو بصرہ تشریف لے جاتے جو اس زمانے میں علم کلام کا سب سے بڑا دنگل تھا، اور وہاں بڑے بڑے جغادریوں سے پنجہ آزمائی فرماتے۔ خود ہی بیان فرماتے ہیں۔

وكان اصحاب الخصومات والجدل اكثرها بالبصرة فدخلت البصرة نيفا وعشرين مرة منها ما اقيم سنة و اقل واكثر۔

لڑائی جھگڑے کرنے والوں کی بڑی جماعت بصرہ میں رہتی تھی۔ میں تقریباً بیس دفعہ بصرہ اسی غرض سے گیا اور وہاں کم و بیش سال سال بھر قیام کیا۔

اس قسم کے بے معنی مباحث میں مسلمانوں کے اُلجھے رہنے سے چونکہ حکومت کا کچھ نہیں بگڑتا تھا بلکہ طرح طرح کی فرقہ بندیوں کی اس سے بنیاد پڑتی تھی جس سے "فَرِّقْ وَاحْكُمْ" (پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو) کے سیاسی نظریہ کی تکمیل ہوتی تھی اس لیے حکومت بھی اس قسم کے جھگڑوں میں دخل نہیں دیتی تھی، بلکہ ممکن ہے کہ

حوصلہ افزائی کرتی ہو۔ امام صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بصرہ اس زمانہ میں مختلف کلامی فرقوں کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ فرماتے ہیں:-

وقد کنت نازعت طبقات الخوارج من الاباضیہ والصفریہ وغیرھم وطبقات الحشو۔

میں نے بصرہ میں خارجیوں کے مختلف فرقوں شلاً اباضیہ اور صفریہ سے مقابلے کیے اور بھی مختلف حشوی طبقات سے مباحثے رہے۔

ان فلسفیانہ خیالات والوں کا کیا حال تھا اس کی شہادت بھی امام ہی کی زبانی سننا چاہیے۔ اپنے ان ذہنی مباحث کو دینی رنگ دینے کے لیے ان لوگوں نے اس کا نام کلام رکھا تھا لیکن ان کا جو حال تھا امام صاحب بیان فرماتے ہیں:-

قوم لیس سیماھم سیماء المتقدمین ولا منھاجھم منھاج الصالحین رأیتھم قاسیتہ قلوبھم غلیظ افئدتھم لا یبالون مخالفۃ الکتاب والسنۃ والسلف الصالح ولم یکن لھم ورع ولا تقی (موفق)

نہ انکی صورتیں پرانے بزرگوں کی سی تھیں اور نہ ان کا طریقہ صالحین کا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ ان کے دل سخت ہیں اور ان کے قلب بے حس ہیں۔ ان لوگوں کو کتاب وسنت کے خلاف بات کہتے میں ذرا باک نہ تھا۔ نہ ان میں تقویٰ تھا نہ خدا ترسی تھی۔

مسلمانوں کا یہ میلان آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اگرچہ ابھی ملک قرآن وحدیث وفقہ کے جاننے والوں سے خالی نہیں ہوا تھا لیکن خدانخواستہ اگر بیچ میں یکایک عمر بن عبدالعزیز کی حکومت قایم نہ ہو جاتی تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ کیا ہوتا؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جس طرح اپنے پہلے خطبہ میں خلفا کی اطاعت کی وہ نوعیت بیان کی تھی جو اوپر مذکور ہوئی اسی طرح انھوں نے پورے عزم اور کامل ارادہ کے ساتھ اس کا بھی اعلان کیا:-

فلو کان کل بدعۃ یمیتھا اللہ علی یدی وکل سنۃ یبعثھا اللہ علی یدی ببضعۃ

اگر حق تعالیٰ ہر بدعت کو میرے ہاتھوں سے مردہ کرے اور ہر سنت کو میرے ہاتھوں پر زندہ کرے اور اس راہ

لحمی حتی یاتی اٰخر ذٰلک علیٰ نفسی کان فی اللہ یسیرا (ابن سعد)

میں میرے جسم کا ایک ایک ٹکڑا کام آئے یہاں تک کہ آخر میں میری جان کی نوبت آجائے تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں یہ بہت ہی معمولی قربانی ہوگی۔

اس باب میں ان کے شغف کا یہ حال تھا کہ عاملوں اور گورنروں کے جو فرامین پایۂ گاہ خلافت سے ان کے زمانہ میں جاری ہوئے تھے ان کے متعلق مورخین کا بیان ہے :-

الا فیہ رد مظلمۃ او احیاء سنۃ او اطفاء بدعۃ او قسم او تقدیر عطاء او خیر حتی خرج من الدنیا (ابن سعد)

ان میں یا تو کسی ظلم کا ازالہ ہوتا یا کسی سنت کے زندہ کرنے کا حکم یا کسی بدعت کے مٹانے کا فرمان، یا کسی کا وظیفہ مقرر ہوتا یا کوئی نیکی کی بات (یہ اسوقت تک ہوتا رہا) جب تک وہ دنیا سے روانہ ہوئے۔

ان ہی باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبائع کا رخ پلٹ گیا۔ قرآن و سنت کی طرف سے جو رجحان گھٹ رہا تھا پھر اس میں نیا جوش اور نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ جہاں تک میرا خیال ہے امام صاحب پر بھی اس عام تحریک کا اثر پڑا۔ خود فرماتے ہیں کہ علم کلام کی ان ہی دلچسپیوں میں میں مستغرق تھا کہ اچانک میرا خیال بدل گیا اور :-

فراجعت فی نفسی بعد ما مضی لی فیہ عمر و تدبرت فقلت ان المتقدمین من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم والتابعین و اتباعھم لم یکن یفوتھم شیء مما ندرکہ نحن وکانوا علیہ اقدر وبہ اعرف واعلم بحقائق الامور ثم لم ینتصبوا فیہ منازعین ولا مجادلین ولم یخوضوا فیہ بل امسکوا عن

ایک مدت علم کلام کی بحثوں میں گذارنے کے بعد میں نے اپنے دل کو ٹٹولا اور سوچنا شروع کیا تو دل نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور تابعین جو گذر گئے، ان لوگوں سے کوئی ایسی بات چھوٹی نہیں تھی جسے ہم اب پانا چاہتے ہیں حالانکہ وہ ان چیزوں کے جاننے کی زیادہ قدرت رکھتے تھے ان امور کے زیادہ عالم تھے، ان کے حقائق سے زیادہ واقف تھے لیکن اس قسم کے مسائل کے متعلق نہ انھوں نے جھگڑے کیے

ذلك... و رأيت خوضهم في الشرائع وابواب الفقه وكلامهم فيه عليه تجالسوا واليه وبه حضوا وكانوا يعلمون الناس ويدعون الى التعليم ويرغبونهم فيه وعلى ذلك مضى الصدر الاول من السابقين وتبعهم التابعون۔

نہ مباحثے۔ وہ ان باتوں میں کبھی منہمک ہی نہیں ہوئے۔ بلکہ ہمیشہ انکے متعلق خاموشی اختیار کی۔ البتہ وہ شرائع و قوانین فقہ کے ابواب میں غور و فکر کرتے تھے، انکے متعلق باتیں کرتے تھے، باہم ان مسائل پر بیٹھ کر فکر و تامل فرماتے تھے اور ان کے متعلق لوگوں کو اُبھارتے تھے، لوگوں کو ان ہی مسائل کی تعلیم دیتے تھے اور انکی طرف بلاتے تھے۔ صدر اول اسی حال میں گذرا جس میں سب سے پہلے اسلام لانے والے صحابہ اور انکے تابعین گذرے۔

بہرحال جہاں تک میرا خیال ہے امام صاحب کی نوجوان حساس فطرت عمر بن عبدالعزیز کے اصلاحی پیغام سے متأثر ہوئی اور اتنی متاثر ہوئی کہ اب تک جو کچھ آپنے کلامی مباحث کا ذخیرہ اپنے دماغ میں جمع کیا تھا سب میں ایک دفعہ آگ لگادی۔ فرماتے ہیں:۔

فلما ظهر لنا من امورهم هذا الذي وصفناه تركنا المنازعة والمجادلة والخوض في الكلام ورجعنا الى ما كان عليه السلف واخذنا فيما كانوا عليه وشرعنا فيما شرعوا فيه۔

جب میں نے اہل کلام کے اس حال کا اندازہ کیا جس کا میں نے ذکر کیا ہے تو یہ جھگڑے رگڑے میں نے ترک کر دیے اور کلام کے مسائل میں غور و فکر کرنے سے الگ ہو گیا اور سلف جس طریقہ پر تھے اسی کی طرف واپس ہو گیا اور اسی راہ کو اختیار کر لیا جس پر وہ تھے۔

ظاہر ہے کہ اس "انقلابی قدم" نے علم کلام کے اس عالم کو اچانک پھر ایک عامی کی حیثیت میں پہونچا دیا۔ کیونکہ اُس وقت تک انہوں نے شرعی مسائل کی طرف قطعاً توجہ نہیں فرمائی تھی بلکہ ان مسائل سے اس درجہ بے تعلق تھے کہ خود فرماتے ہیں:۔

تذاكروا يوماً الايلاء فقال لصاحب له اى شئ الايلاء فقال لا ادرى۔

لوگوں نے "ایلاء"[1] کے لفظ کا ذکر کیا۔ امام صاحب نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا یہ ایلاء کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا میں نہیں جانتا۔

[1] ایلاء طلاق کی ایک چیز ہے جس میں بیوی سے نہ ملنے کی آدمی قسم (۷۴) کھاتا ہے۔ تفصیلات عام فقہ کی کتابوں میں پڑھیے۔

لیکن ہمت بلند تھی - عمر اگرچہ زیادہ ہو چکی تھی مگر آپ نے اس کی پروانہ کی اور "جہل" کا اعتراف کر کے اس زمانہ میں شرعی علوم کے مشہور امام حماد بن ابی سلیمان کے حلقہ درس میں حاضر ہونے لگے اور اب اس علم کا مذاق آپ پر اتنا مستولی ہوا کہ فرماتے ہیں :-

فصحبتہ عشر سنین — میں دس سال تک ان کے ساتھ رہا -

لوگوں کا بیان ہے کہ تجربہ سے اسکے بعد بھی امام نے اپنے کو اس فن میں پختہ نہ پایا تو پھر رجوع ہو گئے جیسا کہ انھیں کا بیان ہے :-

فلم افارقہ حتے مات — پھر میں ان سے اس وقت تک جدا نہیں ہوا جب تک ان کی وفات نہ ہوئی -

الغرض حضرت عمر بن عبد العزیز کے انقلابی عہد نے ایک طرف تو امام صاحب کو شرعی علوم کی طرف راغب کیا اور دوسری طرف اس کا بھی میدان ان ہی کی حکومت نے تیار کر دیا تھا کہ ہر جاننے والا اپنے علم کی اشاعت کرے اور "اسلامی نظام" میں گذشتہ خلفاء بنی اُمیہ کی بدولت جو رخنے پیدا ہو گئے تھے انھیں بند کرے - واقعات وحالات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب پر ان دونوں تحریکوں کا کافی اثر پڑا تھا - علمی تحریک کے نتائج حاصل کرنے میں تو خدا نے انھیں پوری کامیابی عطا فرمائی - لیکن یکایک پھر زمانے نے پلٹا کھایا اور جس علم کو لے کر امام صاحب چاہتے تھے کہ اصلاح یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے میدان میں اتریں اور اپنا حوصلہ پورا کریں، زمانے نے پھر اسکی راہوں پر کانٹے بچھا دیے - عمر بن عبد العزیز اپنی خلافت کی مختصر مدت (دو ڈھائی سال تقریباً) پوری کر کے اپنے خدا سے جا ملے — اور انکی جگہ جو شخص بنی امیہ کی گدی پر بیٹھا وہ عبد الملک کا بیٹا یزید تھا - تخت پر بیٹھتے کے ساتھ ہی اس نے جو فرمان نکالا وہ تاریخوں میں درج ہے - اس کے چند فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

اما بعد فان عمر کان مغروراً غررتموہ انتم واصحابکم - فاذا اتاکم کتابی ھذا فدعوا ما کنتم تعرفون — اما بعد واضح ہو کہ عمر ابن عبد العزیز ایک فریب خوردہ شخص تھا - تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے اسے خوب دھوکہ میں ڈالا - اب جوں ہی کہ میرا یہ فرمان تمہارے

من عهده - اعيدوا الناس الى طبقتهم الاولى اخصبوا ام اجدبوا احبوا ام كرهوا احيوا ام ماتوا والسلام (عقد الفريد جلد ۲)

پاس پہونچے یک لخت اُن تمام طریقوں کو ترک کردو جو اب تک تم عمرؓ کے عہد کی چیزوں کے متعلق جانتے تھے لوگوں کو پہلی حالت کی طرف واپس لوٹا دو، خواہ سرسبزی کا زمانہ ہو یا خشک سالی کا، لوگ اسے پسند کریں یا ناپسند کریں، جئیں یا مریں۔

اس کے بعد لوگوں کے حوصلوں پہ جو اوس پڑی ہوگی اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے یزید کے بعد امام صاحب کے زمانے میں چھ خلفاء بنی اُمیہ میں ہوئے۔ لیکن ان میں زیادہ تر اسی قسم کے لوگ تھے جو بجائے عمر بن عبدالعزیز کو اسوہ بنانے کے اپنے ان آباؤ اجداد کے نمونوں پر حکومت کرتے تھے جنھوں نے نبوت کی راہ کو چھوڑ کر عجمی سلاطین کا طریقہ اختیار کرلیا تھا۔ خود یہی یزید جو عمر بن عبدالعزیز کے بعد تخت پر بیٹھا اپنی آوارگیوں اور عیاشیوں میں اُس حد کو پہونچا ہوا تھا جس کا تذکرہ سلامہ اور حبابہ کے حسن و عشق کے قصوں میں عام طور پر مشہور ہے۔ یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ سلامہ کی مردہ لاش تک کے ساتھ اس نے مجامعت کی۔ یہی شخص ہے جس نے مشہور ابن ہبیرہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا اور ابن ہبیرہ نے حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو بدسلوکیاں کیں ان کا کچھ ذکر میں پہلے کرچکا ہوں۔ آپ کو اتنے تازیانے لگائے تھے جس سے آپ کی کھال اُدھڑ اُدھڑ جاتی تھی۔ ایسی صورت میں حکومت کی جانب سے اصلاحی تحریکوں کے پھلنے پھولنے کا کیا موقعہ مل سکتا تھا بھلا جو اپنی رعایا کے ساتھ اس حد تک ظلم کرنے پر آمادہ ہو کہ "وہ مریں یا جئیں لیکن حکومت اپنے مطالبات میں سے ایک رتی برابر بھی تخفیف نہیں کرسکتی" اس سے کیا امید ہوسکتی تھی کہ وہ نظام شریعت کے احیاء میں لوگوں کی امداد کریگا؟

لیکن اخلاص کے ساتھ جس تحریک کی بنیاد ڈالی جاتی ہے قدرت اسکو بالآخر ناکام ہونے نہیں دیتی۔ عمر بن عبدالعزیز تو ایک نرسنگھا پھونک کر چلے گئے اور ان کے بعد فوراً اس آواز کو دبا دینے کی کوشش کی گئی، تاہم اس دبی ہوئی حالت میں یہ چنگاری ان دلوں میں اندر ہی اندر سلگتی رہی جنھوں نے انکے پیغام کو عزم کی طاقت کے ساتھ قبول کیا تھا۔ میرے سامنے اس وقت دوسروں کا حال نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ میں یہاں صرف اس نوجوان کا

حال بیان کرتا ہے جو بعد کو امت میں "الامام الاعظم ابو حنیفۃ النعمان" کے نام سے مشہور ہوا (قدس اللہ سرہ و روح روحہ) امام صاحب میں جو علمی انقلاب پیدا ہوا تھا اس کا قصہ تو مشہور ہے۔ لیکن علم کے بعد جس چیز کا درجہ ہے یعنی عملی انقلاب اُس میں امام ابو حنیفہ نے کیا کام کیا اور اتنے شدید موانع کے ہوتے ہوئے اس میں انھوں نے کس طرح کامیابی حاصل کی، اگرچہ مورخین نے ان کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا ہے لیکن جستہ جستہ مقامات میں جو باتیں پائی جاتی ہیں، ان سے کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

۳۔ خلافت اور پادشاہی کا فرق

امام صاحب نے اپنے عمل کا نظام نامہ کیا مرتب کیا تھا؟ سچ تو یہ ہے کہ اس کا صحیح علم اُسی وقت ہو سکتا تھا جب کہ امام صاحب خود یا انکے شاگردوں کا کوئی بیان اس سلسلہ میں مجھے کسی طرح مل سکتا مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ تو بڑی بات ہے، یہاں تو ارباب تاریخ نے بھی کوئی مسلسل چیز اس ذیل میں نہیں چھوڑی ہے۔ لیکن امام صاحب کا نظام نامہ اگر ہمارے پاس نہیں ہے تو کیا ہوا، ان کا کام تو ہمارے سامنے ہے۔ آخر "اِن" سے بھی تو "لِم" تک راہ بنائی جاتی ہے اور پھلوں سے اکثر درختوں کو پہچانا گیا ہے۔ میری کوشش کی بھی اس راہ میں یہی نوعیت ہے۔

میں نے عرض کیا تھا، امام کو اپنی جوانی کے دنوں میں روشنی کے بعد جس تاریکی سے سابقہ پڑا تھا وہ یزید بن عبد الملک کی حکومت اور اس حکومت کی بنیاد کا وہ اساسی فرمان تھا جسے عقد الفرید سے میں بجنسہٖ نقل کر چکا ہوں۔ اس فرمان کا وہ فقرہ یعنی اعیدوا الناس الی طبقتھم الاولی در اصل تشریح کا محتاج ہے کہ اسی کی تشریح سے امام کے ابتدائی منصوبہ (پروگرام) کا جہاں تک میرا خیال ہے کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس فقرہ کا سیدھا سادہ مطلب تو یہی ہے کہ عمر بن عبد العزیز کی حکومت سے پہلے مسلمان جس حال

میں تھے، اسی حال کی طرف وہ واپس کر دیے جائیں۔ یہ یزید نے اپنے گورنروں کے نام حکم جاری کیا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کا وہ حال کیا تھا جس کی طرف وہ انھیں لوٹا کر پہونچانا چاہتا تھا؟

ممکن ہے لوگوں کو مجھ سے اختلاف ہو، لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کچھ اسی زمانہ میں نہیں بلکہ تقریباً ایک حد تک ہر زمانہ میں حکومتوں کے اثر سے زیادہ تر وہی بگڑتے ہیں جو دراصل خود بگڑنا چاہتے ہوں خصوصاً مذہب کی حد تک شاید میرا یہ دعویٰ بالکلیہ غلط نہیں قرار دیا جاسکتا۔ علی الخصوص ایسی صورت میں جبکہ حکومت کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں ہو، وہ خود اپنے کو اسی مذہب کا پیرو بتاتے ہوں، اور وہ مرتد و منافق نہ ہوں میرا مطلب یہ ہے کہ خلفاء بنی اُمیہ کی ذاتی زندگی مذہبی حیثیت سے جیسی کچھ ہو لیکن بااینہمہ ان پر بہتان ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ العیاذ باللہ اسلامی عقائد کو ترک کر کے کفر کے خیالات پر وہ مسلمانوں کو مجبور کرتے تھے۔ کون ثابت کرسکتا ہے کہ جس حکومت کے اکثر خلفاء خود جماعت کے پابند تھے، خود امامت کراتے تھے، روزے رکھتے تھے، حج کرتے تھے، وہی مسلمانوں کو نماز روزہ حج اور زکوٰۃ سے روکنا چاہتے تھے؟ یزید بن عبدالملک اپنے فرمان سے جس سابق حال کی طرف مسلمانوں کو لوٹانا چاہتا تھا ظاہر ہے کہ اسکی قطعاً یہ غرض نہ تھی کہ مسلمان بے دین بنا دیے جائیں اور ان میں فسق و فجور پھیلایا جائے۔ کیونکہ نہ اس سے پہلے بنی اُمیہ کے خلفاء نے ایسا کیا تھا، اور نہ عموماً حکومتیں اپنی رعایا کے مذہبی معاملات میں اتنا براہ راست دخل دیتی ہیں۔

سلاطین و امراء کے شخصی حالات سے متاثر ہو کر جو بگڑتے ہیں، زیادہ تر یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جنکی فطرت چھچھوری، اور جنکا دماغ کھوکھلا ہوتا ہے۔ پھر کسی قوم کے چند افراد جب بگڑ جاتے ہیں تو ان کے دیکھا دیکھی دوسرے بھی بتدریج انہی راہوں پر چل پڑتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اسی وقت ہوتا ہے جب یہ خود چلنے پر آمادہ ہوں۔ پختہ عزم اور بلند حوصلہ رکھنے والوں نے جب کبھی یہ طے کر لیا ہے کہ "دہر میں جو کچھ بھی ہو رہا ہو ہونے دو لیکن ہم اس کے ساتھ نہیں گھومیں گے"، تو خواہ کسی قسم کی حکومت ہو ان کو اپنی راہ سے ہٹانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ خصوصاً جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ وہ زمانہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی انتھک

کوششوں نے اسلامی دُنیا کے گوشہ گوشہ کو اہل علم وفضل سے بھر دیا تھا۔ ایک بڑا گروہ ایسے علما کا تقریباً ہر مرکزی مقام پر پیدا ہوگیا تھا جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی نگرانی ہی کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین بنائے ہوئے تھا۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ اسی بنیاد پر حضرت عمر بن عبد العزیز کو قوم کی جانب سے معلم العلماء کا خطاب دیا گیا تھا۔ ابن سعد نے مشہور محدث میمون بن مہران سے نقل کیا ہے۔

کان عمر بن عبد العزیز معلم العلماء ج ۶ ص ۲۷۱ — عمر بن عبد العزیز علما کے معلم اور استاذ تھے۔

بہر حال اور کسی حکومت کے عہد میں ایسا ہو یا نہ ہو، لیکن جس عہد میں حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے ہوش سنبھالا تھا، اس وقت مختلف وجوہ سے مسلمانوں کا مذہب ان کا دین[1] سلاطین و امراء کے دسترس سے باہر تھا، کم از کم میرا تو یہی خیال ہے۔ لیکن باوجود اس کے مسلمانوں کی زندگی کے دو شعبے، یعنی ان کا مال اور ان کا انصاف حکومت کے پنجوں میں پھنسا ہوا تھا اور یہ دو چیزیں ہی ایسی کہ حکومت کے سوا اسکی نگرانی کوئی دوسری طاقت کر بھی نہیں سکتی۔ خلافت کے نام سے حکومت کا جو نظریہ اسلام نے پیش کیا تھا منجملہ اور خصوصیات کے ان دونوں شعبوں میں اس کا جو نقطۂ نظر تھا، اور خلافت کے نظریہ کو بادشاہت اور ملوکیت کے نظریہ سے جب بدل دیا گیا تو پھر حکومتوں کا جو طرز عمل اس سلسلہ میں ہوگیا تھا، اگرچہ اجمالاً اس کا علم تقریباً ہر پڑھے لکھے مسلمان کو ہے لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اسکی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے نہیں آسکتی جب تک کہ چند جزئی مثالوں سے اُسے واضح نہ کیا جائے۔

اسلامی اموال یا بیت المال کے متعلق خلافت کے نقطۂ نظر کی تعبیر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اُن واقعات سے ہوسکتی ہے جو تواتر کی حیثیت میں تاریخ کی اکثر کتابوں میں عموماً بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ آپ کے پاس کوفہ کا عامل آیا۔ حضرت اندر تھے۔ عامل وہیں بلا لیا گیا۔ اس نے دیکھا کہ حضرت کھانا تناول فرما رہے ہیں۔ وہ سخت متعجب ہوا جب ایشیا و افریقہ کے اتنے بڑے بادشاہ کے سامنے صرف جَو کی روٹیاں اور زیتون کا تیل رکھا ہوا تھا۔ عامل نے کہا کہ آپ کے ممالک محروسہ میں گیہوں کی کافی مقدار پیدا ہوتی ہے پھر حضرت

[1] مولانا نے یہاں دین کا لفظ بڑے ہی تنگ اور محدود معنوں (۲۵) میں استعمال کیا ہے۔ ترجمان القرآن

جَو کی روٹی کیوں تناول فرما رہے ہیں؟ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ کیا گیہوں کی اتنی مقدار پیدا ہوتی ہے کہ ہر ہر مسلمان تک اسکی روٹی پہونچ جائے؟ اس نے کہا کہ اسکی ذمہ داری کون لے سکتا ہے؟ فاروق نے اس وقت خلافت کے نظریہ کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا: "مسلمانوں کا امیر گیہوں کی روٹی اُس وقت تک کیسے کھا سکتا ہے جب تک ہر مسلمان کو جو ہمارے علاقہ میں آباد ہے گیہوں کی روٹی نہ پہونچ جائے"۔ عام رمادہ میں آپکا غلام کچھ گھی اور پنیر لے آیا۔ حضرت نے فرمایا مجھے مسلمانوں کے حال کا احساس کیسے ہو سکتا ہے جب تک کہ خود بھی وہی نہ کھاؤں جو عام مسلمان کھاتے ہیں (کامل ابن اثیر و ابن سعد وغیرہ میں اس قسم کے واقعات کا ایک ذخیرہ موجود ہے)۔

لیکن جب خلافت سلطنت کے قالب میں ڈھل گئی تو مسلمانوں کا وہی امیر، جسکے فرائض کی ذمہ داریاں خواہ جتنی بھی اونچی ہوں لیکن مالی حقوق کے میدان میں وہ مسلمانوں کی صف کا سب سے آخری آدمی قرار دیا گیا تھا، اب بادشاہ بن کر وہ اسلامی اموال کا سب سے پہلا مطلق العنان خود مختار حق دار بن گیا۔ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہی گدی جس پر بیٹھنے والوں کو خلافت کے زمانہ میں اس حال میں پایا گیا تھا جیسا کہ امام مالک حضرت انس رضی اللہ عنہ کے واسطے سے راوی ہیں کہ :-

رأیت عمر بن الخطاب وھو یومئذ	میں نے عمر بن الخطاب کو دیکھا اس زمانہ میں جب کہ وہ
امیر المومنین قد رقع بین کتفیہ	مسلمانوں کے امیر تھے کہ اپنے مونڈھوں کے بیچ کُلّا
برقع ثلاث لبد بعضھا فوق بعض	تین پیوند لگا ہوئے ہیں، ایک کو دوسرے کے ساتھ چپکا دیا گیا تھا۔

اور یہ تو امام مالک جیسے ثقہ راوی کا بیان ہے۔ ورنہ تاریخوں میں دس دس بارہ بارہ پیوندوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ ان پیوندوں میں کبھی کبھی سُرخ چمڑے کا ٹکڑا بھی ہوتا تھا۔ اور جس کے توشہ خانہ عامرہ کی یہ رپورٹ ہے کہ کبھی کبھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وقت مقررہ پر گھر سے باہر نہ نکلتے، وجہ پوچھی جاتی تو اس زمانہ کی دُنیا کا سب سے بڑا فرمانروا جواب دیتا :

غسلت ثیابی فلما جفت خرجت الیکم (ازالۃ الخفاء) کپڑے دھو رہا تھا جب خشک ہوئے تو تم لوگوں کے پاس آیا ہوں

لیکن رسول کی یہی گدی مدینہ منورہ سے منتقل ہو کر جب دمشق پہونچتی ہے تو اس پر بیٹھنے والوں میں سے ایک کو گھر میں نہیں سفر میں اور وہ بھی حج کے سفر میں دیکھا گیا کہ

خرج حاجا فحمل ثیاب ظھرہ علے ستمائۃ — حج کے ارادہ سے نکلا اور چھ سو اونٹوں پر صرف اسکے بدن کے کپڑے تھے۔

حمل۔ (عقد الفرید ص ۳۶۶ ج ۱)

یہ عبد الملک کا بیٹا ہشام خلفاء بنی اُمیہ کا پانچواں خلیفہ تھا۔ زمانہ کی کیسی نیرنگیاں ہیں؟ مسلمانوں کا وہی مال جسکی ذمہ داریوں کے احساس میں کبھی اتنی نزاکت ہو جاتی تھی کہ بحرین سے کچھ مشک کے نافے آتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو وزن کرانا چاہتے ہیں، آپ کی حرم محترم بی بی عاتکہ فرماتی ہیں کہ حکم ہو تو میں تول کر بتادوں، آپ چپ ہو جاتے ہیں، وہ پھر عرض کرتی ہیں، حضرت عمر نے اسکے بعد جواب میں جو کچھ فرمایا دنیا کی قوموں میں نہ پہلے اس کی نظیر تھی اور نہ آئندہ اب تک ملی ہے، بی بی صاحبہ کو مخاطب فرما کر ارشاد ہوتا ہے:۔

لا احب ان تضعیہ فی الکفۃ ثم تفعلین — میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ تم ترازو کے پلے میں مشک کو رکھو اور پھر یوں کرو (ہاتھ سے آپنے اشارہ فرمایا)

ھکذا۔

راوی کہتے ہیں کہ حضرت کا مقصد یہ تھا کہ چھونے چھانے سے ہاتھ میں مشک کی جو خوشبو رہ جائیگی اور تم نے اپنے اوپر اسے مل لیا، تو؟

فاصیب بذالک فضلا علے المسلمین — عام مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ حصہ ہم تک پہونچ جائے گا۔

(ازالۃ الخفاء)

بیت المال کا یہی مال ہے، مسلمانوں کے حقوق اس کے ساتھ اسی طرح بلا کم و کاست متعلق ہیں جس طرح پہلے تھے، مگر خلافت کے نام سے رسول کی وراثت کے مدعی بنکر جو بادشاہت کرتے تھے وہی اس مال کو خرچ کرتے ہیں اور کس پر خرچ کرتے ہیں، ابن عبد ربہ کی زبانی سنیئے عقد الفرید میں لکھتے ہیں

كتب الوليد الى المدينة يحمل اليه اشعبَ فالبسه سراويل جلد قرد له ذنب، وقال له ارقص وغنّ صوتاً ما يعجبني فان فعلت اعطيتك الف درهم فرقص وغنّی فاعجبه فاعطاه الف درهم ص ۲۷۱	ولید نے مدینہ لکھا کہ اشعب (مسخرہ) کو میرے پاس بھیجدیا جائے۔ اشعب جب دمشق پہونچا تو ولید نے بندر کی کھال جس میں دُم بھی تھی اسے پہنائی اور فرمائش کی کہ کھال پہنے ہوئے تم میرے سامنے ناچو اور گاؤ۔ اگر ایسا کروگے تو ہزار درہم تمہیں انعام دونگا۔ اشعب ولید کے سامنے

ناچا گایا۔ ولید کو پسند آیا اور ہزار درہم اس نے انعام میں دیئے۔

اور یہ کوئی نادر یا الشاذ واقعہ نہیں ہے بلکہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے سوا مسلمانوں کے بیت المال کو ان خلفا میں سے اکثر نے اپنی ذاتی ملکیت قرار دے رکھا تھا۔ من مانے طرز پر جس طرح جی چاہتا تھا اس میں تصرف کرتے تھے۔ کس کو دے رہے ہیں، کتنا دے رہے ہیں، کس لیے دے رہے ہیں، ان سوالات میں سے کوئی سوال ان کے سامنے نہیں تھا۔ تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔ گڑے مردوں کی ہڈیاں اکھاڑنی فطرتاً میرے لیے نہایت مکروہ شغل ہے اس لیے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ میں نے تمثیل کے لیے ایک واقعہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے پہلے خلیفہ ولید بن عبدالملک کا درج کیا ہے۔ اور دوسری مثال کا تعلق ہشام بن عبدالملک سے ہے جو عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد کا خلیفہ ہے۔ دکھانا یہ مقصود ہے کہ جس حال کی طرف یزید لوگوں کو واپس کرنا چاہتا تھا اس کا سب سے بڑا اہم شعبہ بیت المال ہی کا مسئلہ تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف اپنی خانگی اور ذاتی زندگی سے اسلامی بیت المال کے نقطۂ نظر کو سمجھانا چاہا اور ایسی مثالیں

لہ اشعب عہد بنی امیہ کا مشہور مسخرہ تھا، لطائف و نوادر کے بیان کرنے میں طاق تھا کسی نے پوچھا میاں اشعب ابھی کوئی حدیث بھی تمہیں یاد ہے بولا ہاں مجھ سے نافع نے ابن عمر سے روایت کی ہے کہ جس میں دو خصلتیں ہونگی وہ خدا کے یہاں خالصین مخلصین میں لکھا جائیگا، پوچھا گیا کون سی دو خصلتیں؟ بولا ایک خصلت تو نافع ہی کو یاد نہ رہی تھی اور دوسری میں بھول گیا۔ اسکے بعض عجیب نوادر ”محاضرات“ کی کتابوں میں منقول ہیں۔

پیش کیں جنکی نظیر خلافت راشدہ کے سوا دنیا کی کسی حکومت میں مل نہیں سکتی۔ بلکہ ہر قسم کی قوت جو انھیں حاصل تھی انھوں نے چاہا کہ اسکے ذریعہ سے اس غیر اسلامی روح کو خلافت کے قالب سے نکال دیں۔ لیکن ان کے بعد کے خلفاء[1] میں پھر وہی خبیث روح گھس گئی۔ بنی امیہ کی عادت اتنی بگڑ چکی تھی کہ عمر بن عبد العزیز نے جس وقت اعلان کیا کہ مسلمانوں کا بیت المال مسلمانوں کا ہے اور اس کی تقسیم اسی اصول پر ہوگی جس پر اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے بانٹا ہے تو ابتدا میں اچھی خاصی بے چینی امرا بنی امیہ میں پیدا ہوئی۔ لیکن جب ایک دن کڑک کر بر سر منبر انھوں نے اعلان کیا۔

ان للہ فی بنی مروان ذبحا وایم اللہ لئن کان ذلک الذبح علی یدی (ابن سعد)

شاید بنی مروان پر خدا کی طرف سے کوئی سخت خونریزی مقدر ہے۔ خدا کی قسم یہ خونریزی میرے ہاتھوں اگر ہوئی تو مجھے اس سے انکار نہ ہوگا۔

راوی کا بیان ہے کہ مروانی جانتے تھے کہ عمر ارادہ کا پکا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کر گذرے اس لیے۔

فلما بلغهم ذلك کفوا وکانوا یعلمون صرامته وانه ان وقع فی امر مضی فیه (ابن سعد)

جب مروانی امرا کو اس کی خبر پہونچی تو شورش سے رک گئے کیونکہ عمر کے عزم کی پختگی سے واقف تھے جانتے تھے کہ جس بات کا ارادہ کرتا ہے کر گذرتا ہے۔

ایک دفعہ یہی امرا وفد کی صورت میں ان کے پاس حاضر ہوئے اور اپنا یہ معروضہ پیش کیا۔

انك قصرت بنا عما کان یصنعه بنا من قبلك وعاتبوه (ابن سعد ج ۶)

تم سے پہلے جو سلوک ہم لوگوں کے ساتھ تمہارے پیش رو کرتے تھے، تم نے اسے بہت گھٹا دیا ہے اس پر ان لوگوں نے حضرت عمر کو لعنت ملامت بھی کی۔

اس وفد میں مروانی خاندان کا تقریباً ہر چھوٹا بڑا شریک تھا۔ اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ

[1] مولانا لفظ خلافت اور خلفاء کو اسی طرح استعمال فرما رہے ہیں جس طرح عام مسلمان مورخین استعمال کرتے ہیں۔ خلافت اور بادشاہی کے اصطلاحی فرق کو انھوں نے ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ ترجمان القرآن

بیت المال کے متعلق خلفاء نے لوگوں کو کس بات کا عادی کر دیا تھا؟ حضرت عمرؓ نے اسکے جواب میں ایک ایسی بات کا اعلان کیا کہ اسکے ہاتھ کے طوطے اُڑ گئے اور آخری امید جو عمر کی موت سے وابستہ تھی اس کو بھی ختم ہوتے ہوئے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں فرمایا، اور پورے عزم و ارادہ کے ساتھ فرمایا۔

لئن عدتم لمثل ھذا المجلس لاشدن رکابی ثم لا قدمن المدینۃ ولاجعلنھا اماما شوریٰ (ابن سعد)

اگر تم لوگوں نے پھر کبھی میرے پاس آکر ایسا کیا تو میں سوار ہو کر فوراً مدینہ چلا جاؤنگا اور حکومت کو مسلمانوں کے مشورہ کے سپرد کر دونگا۔

جسکے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی حکومت اور ان کے بیت المال کو تمہارے خاندان سے ہٹا کر پھر مسلمانوں ہی کے حوالہ کر دونگا۔ ظاہر ہے کہ ان میں ایسے افراد بھی شامل تھے جو عمر کے بعد اپنی خلافت و بادشاہت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں سارا خواب، خواب پریشان ہو کر نہ رہ جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اسکے بعد پھر اس قسم کی آواز ان لوگوں کی طرف سے نہیں اٹھی۔

اور یہ تو بیت المال کے مصارف کا حال تھا۔ خلافت راشدہ کے بعد مداخل میں بھی جو بے اعتنائیاں برتی جاتی تھیں، انکی داستان طویل ہے۔ بس وہی مشہور تاریخی واقعہ اسکا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ جب مصر کے قبطیوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا اور اسکی وجہ سے جزیہ کی آمدنی کم ہونے لگی تو اموی خلیفہ نے گورنر مصر کے نام حکم بھیجا کہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے روکے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک حضرت عمر بن عبدالعزیز ہی نے اپنے فرمان سے اسکا انسداد نہ فرمایا۔ شریح بن حبان مصر کے گورنر تھے انھوں نے حسب دستور قدیم بارگاہ خلافت میں اطلاع بھیجی کہ

ان اھل الذمۃ قد اسرعوا فی الاسلام وکسروا الجزیۃ

ذمی رعایا تیزی سے اسلام میں داخل ہوتی چلی جا رہی ہے جس سے جزیہ کی آمدنی میں ٹوٹا آرہا ہے۔

لیکن اب تخت خلافت پر ولید یا عبدالملک نہیں تھا بلکہ عمر فاروق کا نواسہ تھا۔ جواب میں ارقام فرمایا

اما بعد فان اللّٰہ بعث محمدا صلی اللّٰہ علیہ وسلم داعیا ولم یبعثہ جابیاً فاذا اتاک کتابی ھذا فان کان اھل الذمۃ اسرعوا فی الاسلام وکسروا الجزیۃ فاطو کتابک واقبل۔ (ابن سعد ج ۵ ص ۲۸۳)	اما بعد معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی اور خدا کی طرف بلانے والا بنا کر مبعوث کیا تھا۔ حضور کو خدا نے محصول (ٹیکس) وصول کرنیوالا بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ جس وقت میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے اور ذمی رعایا تیزی سے اسلام میں داخل ہوتی چلی جارہی

ہو جسکی وجہ سے جزیہ کی آمدنی ختم ہو رہی ہو، تو اپنے حساب کتاب کے رجسٹر کو لپیٹ کر فوراً میرے پاس چلے آؤ۔

انھوں نے صرف یہ ہی نہیں کیا، بلکہ تمام صوبوں کے عمال و ولاۃ کے نام احکام جاری کیے کہ

ان یدعوا اھل الجزیۃ الی الاسلام	جزیہ دینے والوں کو اسلام کی دعوت دی جائے۔

مروانی حکومتوں کے بگاڑے ہوئے ایک خراسانی امیر نے اس پر عرض کیا کہ دل سے یہ لوگ اسلام نہیں لاتے اس لیے مناسب ہے کہ ختنہ کرانا بھی ان کے لیے آپ ضروری قرار دیجیے۔ اس نے سمجھا تھا کہ شاید اس تدبیر سے مقصد میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ لیکن حضرت نے جواب میں فرمایا

(فاردھم عن الاسلام بالختان؟	کیا ختنہ کی وجہ سے میں ان لوگوں کو اسلام سے روک دوں؟

اس کے بعد جو بات آپ نے فرمائی، اُن تشدد پسند مولویوں کے لیے اسمیں عبرت ہے جو مچھروں کے بچانے کیلیے اونٹوں کو قربان کر دینے کے عادی ہیں، اور جو ایسا نہیں کرتا اس پر مداہنت کا الزام لگاتے ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز سے زیادہ اسلامی تاریخ میں صحابہ کے بعد متصلب فی الدین ہونے کا دعویٰ کون کرسکتا ہے؟ لیکن وہی کہتے ہیں اور ختنہ جیسی موکدہ سنت بلکہ شعاری سنت کے متعلق فرماتے ہیں۔

ھم لو قد اسلموا فحسن اسلامھم کانوا الی الطھرۃ اسرع (ابن سعد)	جب وہ اسلام لے آئینگے اور انکا اسلام خوب اچھی طرح انکے دلوں میں جم جائیگا تو ختنہ کی طرف خود دوڑینگے۔

راوی کہتا ہے کہ اس نرمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک اس علاقہ میں

(اسلم علی یدہ اربعۃ آلاف) انکے ہاتھ پر چار ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔

بہرحال یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مصارف کے ساتھ مداخل میں بھی اسلامی حدود کی پرواہ نہ کی جاتی تھی، اور اس سلسلہ میں یہاں تک غلو بڑھ گیا تھا کہ مالی ترقیوں کی ہوس میں اسلام کے تنزل تک کو گوارا کر لیا جاتا تھا۔

بیچارے حضرت عمر بن عبد العزیز نے مداخل کی اصلاح کی بھی پوری کوشش کی۔ لیکن اس اصلاحی تحریک کی وجہ سے خزانہ کو جو تاوان برداشت کرنا پڑتا تھا، ہر شخص کے قلب میں اسکی قوت کہاں تھی جو عمر بن عبد العزیز کی طرح تاوان کی شکایت کو سن کر یہ فرماتا، جیسا کہ میمون بن مہران سے روایت ہے کہ کسی علاقہ کا عامل حاضر ہوا آپ نے محصولات کی آمدنی کا حال پوچھا، اس نے جمع بتائی تو گزشتہ خلفاء کے زمانہ سے وہ بہت کم نکلی، حضرت نے وجہ پوچھی، عامل نے کہا کہ فلاں فلاں مدوں کی آمدنیوں کو آپ نے رد کر دیا یہ اسی کا نتیجہ ہے، جواب میں ارشاد ہوا۔

ما الغیتہ ولکن اللہ الغاہ (ابن سعد) یعنی ان محصولوں کو ساقط نہیں کیا ہے۔ انکا ساقط کرنیوالا تو خدا ہے۔

بیت المال کی جو حالت ان خلفاء کے زمانہ میں ہو گئی تھی اس کے اندازہ کے لیے غالباً میرا اتنا بیان کافی ہو سکتا ہے۔

اب میں دوسرے مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، یعنی مسلمانوں کا جو "انصاف" ان خلفاء کے ہاتھ میں تھا اس پر کیا گذر رہی تھی۔

کس قدر افسوس کی بات تھی کہ وہی "عدل" جسکے متعلق قرآن نے کفر و اسلام کی تمیز باقی نہیں رکھی ہے، اور جن قوموں سے مسلمانوں کو عداوت و بغض کا تعلق ہو قرآن نے ان کے ساتھ بھی انصاف ہی کرنے کا حکم دیا ہے، اللہ اکبر جس شریعت کے شارع (علیہ السلام) نے علی رؤس الاشہاد یہ اعلان کیا ہو،

ولو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔ (اعاذھا اللہ منہ) فاطمہ بنت محمد (اعاذہا اللہ تعالیٰ) بھی اگر چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دونگا۔

اور جہاں جبلہ بن ایہم جیسے بادشاہ کی شاہی قوت کو ایک معمولی غریب بدو کے انصاف پر ہمیشہ کے لیے قربان کر دیا گیا ہو، ایک بے جان بُت کی آنکھ کے بدلہ میں زندہ مسلمان سپاہی کی آنکھ صرف اس لیے کہ انصاف قایم ہو قانون کا احترام باقی رہے، ایک کافر کے حوالہ بخوشی کر دی جاتی ہو[1] مگر جب خلافت نے سلطنت کا چولا بدلا، اس وقت کیا ہوا اور کیا ہوتا رہا؟ ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے صرف یہی نہیں کہ قانون کے نافذ کرنے میں قریب و بعید دوست و دشمن کا فرق کیا جاتا تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قانون کی اپنے مطلب کے مطابق تشریح کا حق بھی ان بادشاہ خلیعوں" اور ان کے ولاۃ و حکام نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جب مدینہ منورہ کے والی عمرو بن سعید نے عبدالملک کے حکم سے چاہا کہ مکہ معظمہ پر فوجی حملہ کیا جائے اور اس لیے وہ مدینہ ہی سے فوج بھیجنے کا سامان کر رہا تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابو شریح کھڑے ہوئے بخاری میں ہے کہ انھوں نے فرمایا:۔

ایذن لی ایہا الامیر احدثک قولاً قام بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الغد من یوم الفتح سمعتہ اذنای و وعاہ قلبی والبصرتہ عینای حین تکلم بہ۔

اے امیر مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ سے ایک ایسی بات کہوں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے دن فرمایا تھا۔ میرے دونوں کانوں نے اسے سُنا ہے، اور میرے دل نے اسے یاد رکھا ہے، اور جس وقت حضور ارشاد فرما رہے تھے میری آنکھیں حضور کو دیکھ رہی تھیں۔

ابو شریح نے اپنے کلام میں اتنی قوت پہنچانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور حکم کہ "حرم مکہ میں خونریزی وغیرہ ہمیشہ کے لیے حرام کی جاتی ہے" بیان فرمایا۔ لیکن سب کچھ سننے کے بعد عمرو بن سعید

---

[1] یہ قصہ مصر میں پیش آیا تھا کسی مسلمان سپاہی نے ایک بُت کی آنکھ توڑ دی۔ بُت کا مالک حضرت عمرو بن عاص کے پاس دعویٰ خواہ ہوا۔ فیصلہ یہی کیا گیا کہ تم بھی سپاہی کی آنکھ توڑ دو۔ اگرچہ بُت پرست نے روپیہ لیکر خود معاف کر دیا لیکن اسلام نے تو مسلمان کی آنکھ کو کفر کے حوالہ اسی لیے کر دیا کہ انصاف کیلیے تم اسکو توڑ سکتے ہو۔ خلافت راشدہ کی تاریخ کا ورق ورق ان حیرت انگیز واقعات سے معمور ہے بطور مثال کے یہ چند مشہور باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ عام ناظرین اس واقعہ کو قاضی سلیمان مرحوم کی سیرت رحمۃ للعالمین جلد سوم میں دیکھ سکتے ہیں۔

جو خود اپنے کو اسلامی قوانین کا شارح سمجھتا تھا آپ کو مجبور کر کہتا ہے ۔

انا اعلم منك يا اباشريح انها لا تعيذ عاصيا ولا فارا بدم ۔ | ابو شریح! میں تم سے زیادہ عالم اور ان امور کا جاننے والا ہوں حرم کسی نافرمان اور خون کرکے بھاگنے والے کو پناہ نہیں دیتا۔

بیچارے ابو شریح (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اسکے بعد یہ فرما کر چپ ہو گئے :-

انی کنت شاهداً وكنت غائبا وقد امرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يبلغ شاهدنا غائبنا وقد ابلغتك فانت وشانك (بخاری) | میں تو حضور کی صحبت میں موجود تھا اور تم غائب تھے۔ حضور کا چونکہ فرمان تھا کہ ہم میں جو حاضر ہوں وہ انکو پہونچادیں جو ہم میں غائب ہوں، لہذا میں نے تم کو پہونچا دیا۔ اب تم جانو، اور تمہارا کام ۔

”قانون“ اور ”انصاف“ کے ساتھ خلفا کا یہی طرزِ عمل تھا، جس کی اصلاح کا ارادہ فرماتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اعلان کیا تھا۔

لست بقاضٍ ولكني منفذ ولست بخير من احدٍ ولكني اثقلكم حملا واحسبه قال ولست بمبتدع ولكني متبع. طبقات ج۲ صـ ۲۷۱ | میں فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں (میرا کام بحیثیت خلیفہ ہونیکے) صرف نافذ کرا دینا ہے۔ تم میں سے کسی ایک سے میں بہتر نہیں ہوں لیکن میرا بازو زیادہ بوجھل ہے اور میری بازپرس زیادہ سخت ہے۔ میں دین اور شرعی قانون میں کسی کی بیشی کتر بیونت کا حق نہیں رکھتا بلکہ قانون جس حال میں ملا ہے اس کا اتباع ہی میرا فرض ہے ۔

دراصل یہ تین منفی فقرے خلافت اسلامی کے اصول عدالت اور اموی پادشاہی کے طرز عدالت کا بنیادی فرق پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔

پہلا فقرہ کہ ”میں فیصلہ کرنے والا قاضی نہیں ہوں بلکہ بحیثیت خلیفہ ہونے کے میرا کام صرف نافذ کرا دینا ہے“ مروانی خلفا اور ان کے ولاۃ کے اس طرز عمل کی تردید ہے کہ وہ شریعت کی تشریح اور واقعات پر اسکے انطباق کا اپنے کو مختار قرار دیے ہوئے تھے۔

دوسرا فقرہ کہ "تم میں سے کسی ایک سے بہتر نہیں ہوں" یہ اس غلط خیال کی تردید تھی جسکے سلاطین اور انکے حوالی موالی ہمیشہ شکار رہے ہیں۔ یعنی عام رعایا برایا سے وہ اپنے کو ایک الگ جنس قرار دیتے تھے اور اسی لیے چاہتے تھے کہ قانون انکے ساتھ وہ برتاؤ نہ کرے جو عام لوگوں کے ساتھ کرتا ہے۔

تیسرا فقرہ کہ "دین اور شریعت (قانون) میں مجھے کسی کی بیشی یا کثر بیونت (ابتداع) کا اختیار نہیں ہے، بلکہ میرا کام صرف شریعت کے احکام کی تعمیل واتباع ہے" یہ ان بیجا تصرفات کی طرف اشارہ تھا جو شریعت کے قوانین میں اپنے من مانے اغراض کے تحت خلفاء کر رہے تھے، اور شائد اس کا اپنے کو حقدار سمجھتے تھے۔ آپنے اس اعلان کے ذریعہ اس بدعت شنیعہ کی بیخکنی کرنی چاہی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد اگرچہ قضا کے محکمے ہر مرکزی جگہ میں ضرور قایم تھے لیکن جن لوگوں نے "حکومت" (جسکے لغوی معنے حکم اور فیصلہ کرنیکے ہیں) کا مقصد صرف ٹیکس وصول کرنا قرار دے رکھا تھا جسکی طرف حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک بلیغ تعریضی اشارہ ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ "ما بعث اللہ محمدا صلی اللہ علیہ وسلم جابیا" (اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو محصول وصول کرنیوالا بنا کر نہیں بھیجا تھا) ان لوگوں کے عہد حکومت میں بتدریج اس محکمہ کی اہمیت کم ہو جاتی چلی جارہی تھی۔ کہاں ایک وہ زمانہ تھا کہ قاضی کے تقرر کا اختیار براہ راست خلیفہ اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا، اور جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ازالۃ الخفا میں لکھا ہے، یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کی ایجاد تھی کہ ہر صوبہ میں مستقلاً وہ اپنی طرف سے تین نمائندوں کو بھیجتے تھے، ایک والی (وائسرائے) دوسرا قاضی، تیسرا افسر خزانہ۔ حضرت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ تینوں عہدہ دار کسی ایک کے ماتحت نہیں ہوتے تھے، بلکہ ہر ایک براہ راست بارگاہ خلافت کے آگے ذمہ دار تھا۔ شاہ صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

در کوفہ و بصرہ وغیرہما من البلاد حاکمے جدا معین فرمودا و قاضی جدا و تحویلدار بیت المال علحدہ وایں امریست کہ تا زمان حضرت فاروق واقع نشدہ بود۔

کوفہ بصرہ اور دوسرے شہروں میں حضرت عمر حاکم اعلیٰ (گورنر) جدا، قاضی (جج) جدا، اور بیت المال کا تحویلدار جدا مقرر فرماتے تھے۔ اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے، جسکا ثبوت حضرت فاروق اعظم سے پہلے نہیں ملتا۔

علاوہ دیگر مصالح کے ایک بڑا فائدہ شاہ صاحب کے خیال میں اس کا یہ تھا کہ

اگر بالفرض از یکے خیانتے ظاہر شود، دیگرے بانکار برخیزد، و اجتماع جماعۃ مسلین کہ مجرب بصدق باشند برخیانت بعید ست صـ۶۶ ازالۃ الخفاء ج ۲

بالغرض کسی سے اگر بد دیانتی سرزد ہو تو دوسرا ٹوکنے پر آمادہ ہو، اور یہ بات کہ (تینوں کے تینوں) بد دیانتی پر اتفاق کریں ایسی صورت میں کہ ان کی راستبازی کا پہلے سے تجربہ بھی کر لیا گیا ہو ذرا مشکل ہے۔

اسی نظم کا یہ نتیجہ تھا کہ کسی خاص صوبہ سے نہیں بلکہ سارے اسلامی محروسہ سے ممتاز آدمیوں کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ قاضیوں پر والیوں کو کسی قسم کا اقتدار چونکہ حاصل نہ تھا اس لیے بے خوف و خطر جو بات اُنکی سمجھ میں آتی تھی فیصلہ کرتے تھے۔ لیکن جوں ہی خلافت مدینہ سے منتقل ہو کر دمشق پہونچی، قضا اور فصل خصومات کی اہمیت اس درجہ گھٹا دی گئی کہ ہر صوبہ کے والی کو اس کا اختیار دیدیا گیا کہ اپنے صواب دید سے جس شخص کو وہ چاہیں اپنے علاقوں میں قاضی مقرر کریں۔

انما کان ولاۃ البلد ھم الذین یولون القضاء (حسن المحاضرہ صـ۸۸)

یعنی ہر شہر کا والی خود ہی قاضی کو مقرر کر لیتا تھا۔

کیا زیادہ دن کے بعد؟ نہیں، مروان ہی کے زمانہ میں اس کا نتیجہ یہ دیکھا گیا تھا کہ جب وہ مصر دورہ پر پہونچا اور قاضی کو بلایا جس کا نام قاضی عابس تھا۔ عابس کے علم و فضل کا کیا حال تھا تاریخ والے بیان کرتے ہیں:

کان امیا لا یکتب۔

وہ ان پڑھ تھا، لکھنا بھی نہیں جانتا تھا۔

مروان نے اس غیر خواندہ قاضی کو مخاطب کر کے پوچھنا شروع کیا۔

مروان۔ اجمعت کتاب اللہ؟ (کیا تم نے قرآن یاد کر لیا ہے؟)

قاضی۔ لا (نہیں مجھے قرآن یاد نہیں ہے)

مروان۔ فاحکمت الفرائض؟ (تو کیا تم نے میراث کے مسائل کو پختہ کر لیا ہے؟)

قاضی - لا (ان سے بھی ناواقف ہوں)

مروان - (مروان کو اس جواب پر حیرت ہو گئی، اور بولا) فبم تقضی؟ (آخر تم کس چیز سے فیصلہ کرتے ہو؟)

بیچارے عابس اس کا کیا جواب دے سکتے تھے۔ الغرض بجائے خلیفہ کے قاضیوں کا تقرر والیوں کے سپرد کر دینے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ اُن کے دنی اغراض کے مطابق جو آدمی ہوتا تھا اسی کا وہ تقرر کر دیا کرتے تھے۔ ان ہی قاضی عابس صاحب کے تقرر کی وجہ یہ لکھی ہے کہ حضرت معاویہ نے مصر کے والی مسلمہ کو لکھا کہ یزید (کربلائی) کے لیے لوگوں سے بیعت لی جائے۔ حسب الحکم مسلمہ نے بیعت لینی شروع کی۔ اور تو کسی طرف سے انکار نہیں ہوا لیکن حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو فاتح مصر عمرو بن عاص کے مشہور صاحبزادے ہیں اور علم و فضل اور علو سیرت میں لوگوں نے باپ پر بھی انہیں ترجیح دی ہے انہوں نے بیعت سے انکار کیا۔ مسلمہ نے ان کے انکار پر اعلان کیا۔

من لعبد اللہ؟ عبداللہ کو درست کرنے کے لیے کون آمادہ ہے؟

کہا جاتا ہے کہ یہی عابس بن سعید کھڑے ہوئے اور بولے میں اس کام کو انجام دیتا ہوں۔ عبداللہ بن عمرو اس زمانہ میں اپنے والد کے مشہور قصر واقع فسطاط میں قیام فرماتے تھے۔ عابس پولیس کے نوجوانوں کو لے کر پہونچا اور ان کے مکان کو گھیر لیا۔ کہلا بھیجا کہ بیعت یزید کے متعلق اب کیا ارادہ ہے؟ انھیں پھر بھی انکار ہی پر اصرار رہا۔ عابس نے اس کے بعد کیا کیا؟ مورخین لکھتے ہیں۔

دعا بالنار والحطب لیحرق علیہ قصرہ (حسن المحاضرہ) اس نے آگ اور لکڑی جمع کی تاکہ انکے قصر میں آگ لگا دے۔

عبداللہ بن عمرو نے اس کے بعد اپنے کو مجبور اور معذور پایا، بیچارے گھر سے نکلے، اور جو کچھ اس جاہل نے کہنے کے لیے کہا دُہرا دیا۔

ان بیڑھ عابس کا یہی سب سے بڑا کارنامہ تھا کہ ایک صحابی کو آگ میں جلا دینے کی دھمکی دے کر حکومت میں سرخروئی حاصل ہوئی تھی۔ اسی سرخروئی کا یہ صلہ ملا تھا کہ غریب مسلمانوں کی منڈیاں مانگی جانیں، انکے

مال و جائداد حکومت نے سب قرآن و حدیث اور فرائض سے بالکل جاہل اس شخص کے سپرد کر دیئے۔ یہاں تمثیل کے لیے یہ ایک جزئی واقعہ پیش کیا ہے، ورنہ قاضیوں کے تقررات میں جو بے اعتنائیاں مختلف اثرات کے تحت میں برتی جاتی تھیں، انکی داستان طویل ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے قاضی جو اپنے علم و فضل، تقویٰ و دیانت کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض کسی والی کے رحم و کرم پر جیتے تھے، خود تو جو کچھ کرتے ہونگے وہ تو ظاہر ہی ہے، اسکے سوا بھی ان والیوں کے دباؤ سے کہاں تک انکے فیصلے محفوظ رہ سکتے تھے اس کا ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔

شامت کا مارا بیچارہ کوئی قاضی اپنے والی کی مرضی کے خلاف اگر کچھ کر گزرتا تھا تو پھر اسکی خیر نہ تھی۔ سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ میں قضا کا عہدہ طلحہ بن ہرم کے سپرد تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بنی امیہ کا مشہور گورنر خالد[1] بن عبداللہ القسری مدینہ کا والی تھا۔ شیبی خاندان (جو کعبہ کے کلید بردار ہیں) کے دو آدمیوں میں کسی زمین کے متعلق جھگڑا ہوا۔ قاضی صاحب نے ایک فریق کے حق میں جس کا نام اعجم تھا فیصلہ کر دیا۔ لیکن دوسرا فریق خالد کا درباری تھا۔ اس نے فوراً مدینہ پہونچکر خالد سے قاضی کے خلاف حکم حاصل کر لیا۔ قاضی طلحہ کو اس پر غصہ آگیا اور چپ چاپ انھوں نے سلیمان بن عبدالملک کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ خلفاء بنی امیہ میں سلیمان کا شمار بھی مغتنم لوگوں میں ہے۔ قاضی صاحب کا خط جسے بصیغۂ راز قاضی نے اپنے لڑکے محمد بن طلحہ کے ہاتھ بھیجا تھا سلیمان کو ملا تو وہ برہم ہوا۔ اُسی وقت اس نے ایک حکم محمد بن طلحہ کو لکھوا کر دیا کہ سیدھے مدینہ جا کر خالد کے حوالہ کرو اور کہدو کہ اعجم کے معاملہ میں وہ دراندازی نہ کرے۔ محمد بن طلحہ اس خط کو لیکر جس وقت مدینہ پہونچتے ہیں اور خالد کے حوالے کرتے ہیں تو خالد بس یہ سُن کر آگ بگولہ ہو جاتا ہے اور قبل اسکے کہ سلیمان کا خط پڑھے جلاد کو حکم دیتا ہے کہ محمد بن طلحہ کو سو

[1] اموی عہد کا مشہور رئیس ہے۔ اسکی ماں چونکہ نصرانیہ تھی اس لیے ابن النصرانیہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یافعی نے لکھا ہے کہ اس کے نائب طارق نے اپنے بچے کی ختنہ کی۔ خالد کے پاس ہزار غلام اور ہزار جوڑے اور خدا جانے کیا کیا ہزار بھیجے۔ بیت المال کے سلوک کا اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔

کوڑے لگائے - محمد بن طلحہ کا اسکے بعد کیا حال ہوا - اسکا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ قاضی طلحہ نے اپنے بیٹے کے خون آلود لباس کو سلیمان کے پاس بھیجا - سلیمان بھی اس واقعہ کے بعد آپے سے باہر ہوگیا اور حکم دے چکا تھا کہ خالد کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں، لیکن بعض امیروں کی سفارش سے معاملہ ٹل گیا۔[۱]

اور یہ ایک معاملہ نہیں ہے - خلفاء بنی امیہ اور خلفاء بنی عباس کے زمانہ میں ہارون الرشید تک ایسے واقعات مسلسل پیش آتے رہتے تھے - مثالاً میں دونوں خلافتوں کے متعلق ایک ایک واقعہ درج کرتا ہوں -

سیوطی نے اپنی مشہور کتاب "حسن المحاضرہ" میں قاضی خیر بن نعیم کے ذکر میں بنی امیہ کے عہد کا ایک واقعہ یہ بیان کیا ہے :-

ان رجلا من اهل الجند قذف رجلا فخاصمه اليه وثبت عليه بشاهد واحد فامر بحبس الجندي الى ان يثبت الرجل شاهدا آخر فارسل ابوعون عبدالملك بن يزيد فاخرج الجندي من الحبس فاعتزل خير وجلس في بيته وترك الحكم فارسل اليه ابوعون فقال لاحتى ترد الجندي الى مكانه فلم يرد وتم على عزمه ص ۲۷ ج ۲	ایک فوجی سپاہی نے کسی آدمی کو گالیاں دیں - اس نے قاضی خیر کے اجلاس میں دعویٰ دائر کردیا اور اپنے دعوے کے ثبوت میں صرف ایک گواہ پیش کیا قاضی خیر نے سپاہی کو حوالات میں رکھنے کا حکم اسوقت تک کیلئے دیا جب تک کہ مدعی دوسرا گواہ حاضر کرے - مصر کے گورنر ابوعون عبدالملک بن یزید نے اپنا آدمی بھیج کر سپاہی کو حوالات سے نکلوادیا قاضی خیر کو جب اس کی خبر ہوئی تو قضا سے کنارہ کش ہوکر بیٹھ گئے - ابوعون نے انکے پاس آدمی بھیجا (گویا معذرت طلب کی) - لیکن قاضی صاحب نے کہلا بھیجا کہ جب تک سپاہی واپس نہ ہوگا میری واپسی بھی ناممکن ہے - مگر ابوعون نے سپاہی کو واپس نہ کیا - قاضی صاحب بھی اپنے ارادہ پر ڈٹے رہے -

[۱] عقد الفرید ص ۲۶۰ ج ۲

دوسرے واقعہ کا ذکر طاش کبریٰ زادہ اپنی کتاب مفتاح السعادۃ میں مشہور قاضی حفص بن غیاث کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ہارون الرشید نے انکو بغداد کا قاضی مقرر کیا۔ اتفاق سے ہارون کی مشہور چہیتی بیوی زبیدہ کے مرزبان (پٹیل یا نمبردار) کا ایک معاملہ قاضی صاحب کے پاس پیش ہوا۔ مرزبان کسی کا مدیون تھا۔ دین اس پر ثابت ہو گیا۔ قاضی صاحب نے مرزبان کے خلاف ڈگری دیدی۔ زبیدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ قاضی نے یہ جاننے کے بعد کہ مرزبان میرا آدمی تھا، پھر بھی اسکے خلاف فیصلہ کیا، آگ بگولہ ہو گئی۔ ہارون جب محل سرا آیا تو زبیدہ غصہ میں بھری بیٹھی تھی :۔

والحت علے الرشید حتی عزلہ ص ۱۱۹ ج ۲ وہ ہارون کے سر ہو گئی کہ ایسے قاضی کو معزول کر دیا جائے۔

آخر ہارون نے قاضی حفص کو معزول کر دیا۔

ایک مرزبان پر اسلام کا اتنا بڑا عالم محض ایک عورت کی خاطر قربان کر دیا گیا۔

اگرچہ یہ ایک جزئی واقعہ ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ اسکو یاد رکھنا چاہیے۔ آئندہ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہی ہارون الرشید ہے اور وہی اسکی قاہرہ حکومت۔ لیکن امام ابو حنیفہ کے تلمیذ رشید قاضی ابو یوسف جن کا تقرر امام صاحب کی شہادت کے بعد ہارون ہی نے کیا اپنے زمانہ قضا میں ہارون کی بیوی یا حکام ہی کے خلاف نہیں، بلکہ خود ہارون کی مرضی کے خلاف فیصلے کرتے ہیں، لیکن بجز خاموشی کے وہ اپنے لیے کوئی چارۂ کار نہیں پاتا۔ آخر یہ طرز عمل کیوں بدلا، اور اسکے پیچھے کس کے اخلاص و قربانی کی قوت تھی؟ افسوس مورخین نے اس پر غور نہیں کیا۔ بہرحال اتنی مدت کے بعد بکھرے ہوئے واقعات کو جمع کرنے سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کا ذکر تو آئندہ آتا ہے۔ ابھی تو میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے "انصاف" کا جو حال ان خلفاء کے ہاتھوں ہو رہا تھا اسکی نوعیت کیا تھی؟

خلفاء کی ان بیجا طرفداریوں ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ امام ابو حنیفہ ہی نہیں، جن کا واقعہ مشہور ہے، اور بھی اس زمانہ کے کتنے ارباب صدق و امانت، تقویٰ و دیانت، حکومت کے شدید اصرار کے باوجود قضا سے

انکار کرتے تھے، اور اگر مارے باندھے کسی نے قبول بھی کر لیا تو ہمت کر کے وہ خلفاء سے اس کا معاہدہ لیتے تھے کہ فیصلوں میں ذاتیات کو دخل نہ دیا جائیگا۔ ان بیچاروں کی تسلی کے لیے اقرار بھی کر لیا جاتا تھا لیکن زیادہ تر یہ وعدے "عرقوبی مواعید" بن کر شرمندۂ ایفا بہت کم ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں قاضی شریک کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ان خلفاء کے طرزِ عمل پر اس سے روشنی پڑتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابو جعفر منصور عباسی نے قاضی شریک کو بلا کر قضاء کا عہدہ پیش کیا، پہلے تو انھوں نے مختلف حیلے بہانے کیے لیکن جب کوئی بات سنی نہ گئی تب قاضی صاحب نے منصور کو مخاطب کر کے فرمایا :-

انی احکم علی الصادر والوارد، وانا لا ابالی انی احکم علی کل من کان ولا انظر الی القریب والبعید۔ — میں ہر آنے جانے والے وارد و صادر پر فیصلہ کرونگا اور مجھے اسکی پروا نہ ہوگی کہ میں کس کے خلاف فیصلہ کر رہا ہوں۔ کوئی بھی ہو۔ میں نہ (خلیفہ) کے مقربوں کو دیکھوں گا، نہ انکو جو بارگاہ خلافت سے تعلق نہیں رکھتے۔

چند الفاظ کے تلفظ میں منصور کا کیا بگڑ تا تھا، بولا :-

احکم علی وعلی ولدی — آپ میرے اور میری اولاد کے مقابلہ میں بھی فیصلے کر سکتے ہیں۔

گویا منصور نے اپنے پیشروؤں کے مقابلہ میں یہ کہہ کر انتہائی انصاف پسندی کا اظہار کیا۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ اسلام کے قانون عدل کے ماننے والوں کے لیے اس تصریح کی بھلا کیا ضرورت تھی تاہم منصور نے بڑی کشادہ دلی کو راہ دے کر خود اپنے کو اور اپنی اولاد کو قانون کے نیچے ڈالدینے کا اعلان کیا۔ لیکن قاضی صاحب کی اس سے بھی تشفی نہ ہوئی۔ خلفاء سے بھی زیادہ خطرہ جن لوگوں سے تھا، اور زیادہ تر اس زمانہ کا "عدلیہ" ان ہی کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا، کھل کر خلیفہ کے سامنے انھوں نے اس خطرہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا :-

اکفنی حشمك ۔ اپنے حاشیہ نشینوں (درباری امراء، حوالی موالی) سے میری حفاظت کیجیے۔ منصور نے

اسکے جواب میں بھی قاضی صاحب گویہ کہتے ہوئے گویا مطمئن کر دیا کہ افعل (ہاں ! میں ایسا ہی کرونگا)۔

مگر سبب کچھ ہو جانے کے بعد قاضی شریک جب اپنے عہدہ کا جائزہ لے کر اجلاس کے لیے بیٹھتے ہیں تو بدقسمتی سے سب سے پہلا مقدمہ جو ان کے آگے پیش ہوتا ہے وہ خلیفہ کی "مولاۃ" (چھوکری) کا معاملہ کسی شخص سے تھا۔ عادتیں تو عام طور پر بگڑی ہوئی تھیں۔ اجلاس میں جب فریقین حاضر ہوئے تو صرف اس لیے کہ چھوکری خلیفہ کی چھوکری تھی اپنے فریق کے برابر کھڑے ہونے میں اس نے اپنی توہین محسوس کی، اور آگے بڑھ کر قاضی صاحب کے سامنے آگئی۔ وہ مطمئن تھی کہ شاہی آدمیوں کے ساتھ عدالت میں اسی امتیاز کا رواج تھا لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ شاہی انتساب کے جس نشہ میں وہ مخمور ہے نیا قاضی بھی خلیفہ کے معاہدہ کے نشہ سے چور ہے۔ لونڈی کے ہوش اڑ گئے جس وقت قضا کی گدی سے اس کے کان میں یہ آواز گونجی :۔

تاخری یالخناء اوگندی عورت پیچھے ہٹ جا۔

قاضی صاحب کا مطلب یہ تھا کہ یہ اسلامی عدالت ہے جس میں حاضر ہونے والوں کو خواہ وہ مسلمانوں کا سب سے بڑا آدمی یعنی خلیفہ ہی کیوں نہ ہو، ہر ادنیٰ معمولی رعیت کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ قاضی صاحب بیچارے جانتے تھے کہ اب وہ زمانہ باقی نہیں رہا ہے لیکن خلیفہ کے عہد پر اُن کو غرہ تھا اس لیے شاہی لونڈی کی شان میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل پڑے۔ خدا جانے چھوکری کو بھی اپنے آقا کے معاہدہ کا علم تھا یا نہیں۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جانتی تھی۔ خصوصاً جب کہ یہ ایک نئی بات تھی۔ خلیفہ نے دین کے جوش میں بھر کر مدت کی ایک رسم کے خلاف معاہدہ کیا تھا۔ قدرتاً اسکی خبر ہر کہ ومہ کو ہوئی ہوگی۔ بہر حال اگر وہ یہ جانتی بھی تھی تو اسی کے ساتھ ان معاہدوں کا جو وزن تھا اس سے بھی ناواقف نہ تھی۔ ایک کنیز دار الخلافہ کے سب سے بڑے قاضی کو مخاطب کر کے اس فقرہ کا جو جواب دیتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ نقل کرتے ہوئے بھی قلم کانپتا ہے۔ چھوٹتے ہی چھوکری نے بوڑھے قاضی کو کہا :۔

انك شیخ احمق بڈھے تو احمق ہے۔

ایک چھوکری کی زبان سے اسلام کا ایک مشہور عالم یہ جملہ سنتا ہے اور دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسپنے کیے پر پچھتاتا ہے اور کہتا ہے :۔

انی قلت کذالک فلم یقبل مولاک۔ میں نے خلیفہ سے اپنے متعلق یہی کہا تھا (یعنی کہ میں احمق ہوں) لیکن تیرے آقا نے قبول نہیں کیا۔

خیر یہ تو قاضی صاحب نے جواب دیا۔ لیکن شاہی عدالت کی اس صریح اہانت پر منصور نے عام عدالتی رسم کی بنیاد پر نہیں، اسلامی عدالت کے اصول پر نہیں، کم از کم اپنے معاہدہ کی لاج ہی کے لیے اس چھوکری سے کوئی جواب طلب کیا؟ کس قدر عجیب ہے کہ احکم علی وعلی ولدی کا برسر دربار معاہدہ کرنے والا منصور اپنے متعلق یا اپنی اولاد کے متعلق پاس عہدو زبان تو کیا کرتا اپنی ایک چھوکری کے متعلق بھی قاضی صاحب کے اس برتاؤ کو برداشت نہ کر سکا، اور جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے فعزلوہ (قاضی شریک کو لوگوں نے معزول کر دیا)۔

اگرچہ منصور کے بعد مہدی کے اصرار سے قاضی صاحب کو پھر یہ عہدہ قبول کرنا ہی پڑا جس کا ذکر اپنے موقعہ پر انشاء اللہ تعالیٰ آگے آئیگا۔ لیکن منصور کے زمانہ میں تو اس نوکری کا انجام[۱] یہ ہوا۔ ان ہی باتوں کا یہ اثر تھا کہ جو لوگ اپنے دین وعلم کی حفاظت کرنا چاہتے تھے وہ ان خلفاء کے قول وقرار پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ ابن خلکان میں ہے کہ عباسی خلیفہ مہدی نے حضرت سفیان ثوری کو گرفتار کرا کے اپنے دربار میں بلایا اور وہی قضاء کا عہدہ پیش کیا۔ ان کو انکار پر اصرار تھا لیکن وہ قبول کرا لینے پر مصر تھا۔ اس وقت مہدی اور سفیان ثوری میں ایک سخت گفتگو بھی ہوئی جس کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ آئیگا اور اسی وقت یہ بھی معلوم ہوگا کہ جب ان خلفاء کو اپنے ڈھب کے

---

[۱] میں نے یہ سارے واقعات صدر الائمہ موفق بن احمد اور حافظ الدین البزاز الکروری سے لیے ہیں دونوں کتابوں میں واقعہ کے مختلف اجزاء مختلف مقامات میں درج ہیں۔

آدمی بکثرت مل رہے تھے تو پھر ان بیچاروں کو پکڑ پکڑ کر وہ کیوں مجبور کرتے تھے۔ بہر حال حضرت سفیان نے نہ قبول کرنے کی وجوہ میں خلفاء اور ان کے امراء حوالی موالی کی غلط دخل اندازیوں کا ذکر کیا تو اس نے اپنے باپ منصور کی طرح زبانی نہیں بلکہ تحریری معاہدہ لکھ کر حضرت کے حوالہ کرنیکا حکم دیا۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ مہدی نے اپنے میر منشی کو کہا:۔

اکتبوا عہدہ علی قضاء الکوفۃ علی ان لا یعترض علیہ فی حکمہ — کوفہ کی قضاءت کا فرمان اس شرط کے ساتھ لکھ کر انہیں دیدو کہ کوئی ان کے فیصلوں میں دراندازی نہ کریگا۔

معاہدہ لکھ کر حضرت سفیان ثوری کے حوالہ کیا گیا۔ لیکن جس آسمان کے نیچے اور جس زمین کے اوپر آدم کی وہ اولاد تھی جنھیں تم اس زمانہ کے خلفاء اور امراء کے لباس میں دیکھ رہے ہو، وہیں زندگی کی تمام ضروریات رکھنے والی وہ ہستیاں بھی تھیں کہ ایک صوبہ کی ہائی کورٹ کی ججی دی جاتی ہے، لیکن اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ قاضی ابن خلکان راوی ہیں:۔

فاخذہ وخرج فرمی بہ فی دجلۃ وھرب ص۲۱ ج۱ — حضرت سفیان نے فرمان لے لیا، اور دربار سے باہر نکل کر انھوں نے اُسے دجلہ میں پھینکا اور غائب ہو گئے۔

(باقی)